مظلوم قرآن

طلعت محمود بٹالوی

آواز اشاعت گھر

الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

نام کتاب : ________ مظلوم قرآن

مصنف : ________ طلعت محمود بٹالوی

پہلا ایڈیشن : ________ جولائی ۱۹۹۷ء

تعداد : ________ ۵۰۰

ناشر : ________ طلعت محمود بٹالوی
۱۲۸ / ایل ماڈل ٹاؤن ایکسٹینشن
لاہور

پرنٹر : ________ عصمت اسلم پرنٹرز

قیمت : ________ ۱۱۰ / روپے

ملنے کا پتہ ____ آواز اشاعت گھر۔ الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور

کتابت خلیل ساگر

فہرست

پیش لفظ

"مظلوم قرآن" کی اصطلاح حضرت علامہ اقبالؒ نے وضع کی تھی جو کہ ایک بہت ہی جامع اصطلاح ہے۔ اس میں قرآن کریم کے خلاف ہزار سال سے بھی زیادہ سازشوں کی ایک داستان پوشیدہ ہے۔

بقول علامہ رحمت اللہ طارق صاحب

" یہ ایک دردناک المیہ ہے کہ قرآن جیسی واضح، بیّن اور باطل شکن حقیقت" اور ناقابلِ تغیّر" ابدی صداقت" کے الفاظ و معانی کے ساتھ تاریخ کے ہر دَور میں دانستہ یا نادانستہ طور پر مذاق کیا جاتا رہا ہے —— قرآن عرصہ دراز سے ایک خوفناک ذہنی و فکری سازش کی خونی کربلا میں خیمہ زن ہے اور اس کے ابدی حقائق کے خیموں کی طنابوں پر تفقہ فی الدین، تدبر فی الاسلام اور تفکر فی القرآن کے عنوان پر زبان و قلم کے تیر و سناں پے در پے وار کئے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن اس ظلمِ عظیم پر نہ کسی زبان پر حرفِ احتجاج آتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کسی کے دل میں دَرد اٹھے بھی تو کیونکر اور کسی زبان پر حرفِ احتجاج آئے بھی تو کیسے جبکہ تفسیرات تعبیرات، توضیحات، تشریحات، تاویلات اور تنسیخات کا یہ سارا تہ در تہ پیچ در پیچ اور سلسلہ در سلسلہ گورکھ دھندا اسلام اور قرآن ہی کے نام پر تیار کیا جاتا رہا ہے احتجاج تو کوئی اس وقت کرے جب اسے بغاوت یا سازش کا علم ہو۔

اصحابِ تلبیس نے تو باہم نقیض، متحارب اور مشابہ و معارض روایات و حوالہ جات اور تاویلات کا ایسا لامتناہی جال تیار کیا ہے کہ قرآن سے مزاحم ہونے والے

از رُوئے خصومت اور قرآن فہمی کرنے والے از رُوئے تجربہ بجائے اصحابِ تلبیس پر الزام دھرنے کے خود قرآن ہی کو "مجموعۂ تضادات" قرار دیتے ہیں۔"

قرآنِ کریم کے خلاف مندرجہ بالا اقتباس میں سازشوں کی طرف جو اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کی نشاندہی کرنا کسی ایک فرد یا افراد کا کام نہیں۔ اس کے لیے تو حکومتی سطح پر ادارے قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں صرف اس سازش کی نشاندہی کی جائے گی کہ جس سے مسلمانوں کے اذہان میں یہ راسخ کر دیا گیا ہے کہ قرآنِ کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں "کتابی شکل" میں موجود ہی نہ تھا۔ بلکہ یہ مختلف ادوار میں مختلف اطوار سے جمع کیا گیا۔ اور جمع القرآن کی من گھڑت داستان وضع کر کے قرآنِ کریم کی محکمیت کو متزلزل کرنے کی ناپاک کوشش کی گئی ——— اس کی نشاندہی کے ساتھ مختلف محققین کی آرا بھی پیش کی جائیں گی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ آج جو قرآنِ کریم ہمارے پاس موجود ہے وہ وہی ہے جو رسول اللہؐ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں کتابی شکل میں مرتب و مدوّن کرایا اور اس کا ہر ایک لفظ اور اس کی ترتیب وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں "کتابی شکل" میں مرتب و مدوّن ہوئی۔

قرآنِ کریم کی قطعیت کو متزلزل کرنے کی جو سازش کی گئی، اس کے لیے جو باتیں وضع کی گئیں ان کی فہرست جو علامہ عبدالطیف رحمانی صاحب نے اپنی کتاب تاریخ القرآن میں درج کی ہے وہ حسبِ ذیل ہے

۱ قرآنِ کریم آنحضرتؐ کی زندگی میں یکجا لکھا ہوا نہیں تھا۔ آپ کے بعد خلیفۂ اوّل نے ایک جا کر دیا۔

۲ انجیل اور قرآن دونوں اس امر میں یکساں ہیں کہ آنحضرتؐ اور حضرت مسیحؑ

کے بعد کے لوگوں نے انہیں مرتب اور جمع کیا۔

۳۔ دو چار صحابہ کے سوا کوئی پورے قرآن کا حافظ حضرت کی زندگی میں نہیں تھا۔

۴۔ قرآن کا بہت بڑا حصہ تلف ہوگیا یا کر دیا گیا کیونکہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا اور قرآن موجودہ میں ایک ہی حرف ہے۔

۵۔ قرآن کی بعض سورتیں بہت بڑی تھیں لیکن وہ مختصر کر دی گئیں۔

۶۔ بعض سورتیں قرآن سے نکال دی گئیں۔

۷۔ قرآن جس طریقہ سے جمع کیا گیا اس میں بہت زیادہ یہ خیال ہو سکتا ہے کہ قرآن کا کوئی حصہ لکھنے سے رہ گیا ہو۔

چنانچہ خلیفۂ اول کے عہد میں بعض آیتیں لکھنے سے رہ گئی تھیں۔ پھر خلیفہ سوم کے وقت میں لکھی گئیں۔

۸۔ قرآن کی آخری دو سورتیں حضرت عبداللہ ابنِ مسعود کے نزدیک قرآن میں داخل نہیں لہٰذا ان کا قرآن سے ہونا یقینی نہیں۔

۹۔ قرآن کی موجودہ ترتیب ایسی نہیں جس پر تمام کا اتفاق ہو۔ کیونکہ حضرت ابی بن کعب۔ حضرت علی اور حضرت ابنِ سعد (رضی اللہ عنہم) وغیرہ کی قرآن کی ترتیب اس کے خلاف تھی۔

ماخوذ از تاریخ القرآن از علامہ عبدالطیف رحمانی صہ ۱۹-۱۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنِ کریم جب دعائیہ سورہ فاتحہ کے بعد سورہ بقرہ سے اپنا کلام شروع کرتا ہے تو اپنا تعارف کراتے ہوئے اعلان کرتا ہے کہ

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

یعنی یہ ایک ایسی "کتاب" ہے جس میں کوئی شک نہیں۔

قرآنِ کریم کے متعلق لفظِ کتاب تقریباً ستر مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم سب سے پہلے لفظِ "کتاب" کے لغوی معنی سامنے لائیں۔ لفظِ "کتاب" کے لغوی معنی جو علامہ تمنا عمادی نے بیان کئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

"کتاب کی لغوی تحقیق حسب بیان علماء لغت یہ ہے کہ "کتاب" دراصل اس لوہے کے چھلے کو کہتے ہیں جو تحفظِ نسل کے لئے اونٹنیوں کے لیے اونٹنیوں کی شرمگاہوں پر ڈال دیا جاتا تھا کہ وہ ہر قسم کے اونٹ سے حاملہ نہ ہو سکیں پھر اس کے بعد اونٹنی کے نتھنوں کو ملا کر ان میں ایسا ہی چھلا پہنا دیا جاتا تھا کہ وہ اپنے بچے کو نہ سونگھ سکے اور اس طرح اپنے بچے کو دودھ نہ پلا دے۔ پھر اس کے بعد چند چیزوں کو چھلا ڈال دینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ چونکہ کتاب میں بھی ان کے اوراق کو ملا کر چھلا ڈالا جاتا تھا۔ یا جیسا کہ آج کل چھلے کے بجائے دھاگہ ڈال دیا جاتا ہے۔ اس لیے کتاب عرفی پر بھی اس کا اطلاق کیا جانے لگا۔ اس کے بعد اس میں مزید وسعتیں ہوتی چلی گئیں۔

(ملاحظہ ہو محیط المحیط جلد ۲ صفحہ ۱۷۸۹) اور دیگر مبسوط لغات عربی۔

بہر حال اس تحقیق سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ کتاب کے مفہوم میں چند چیزوں کو ملا کر مجتمع کر دینا ضروری ہے۔ لہذا کتاب کا اطلاق اصل لغت کے لحاظ سے اسی مجموعۂ اوراق پر کیا جا سکے گا۔ جس کی شیرازہ بندی کسی کپڑے یا دھاگے سے کر دی گئی ہو۔ قرآن کریم ایک دو جگہ نہیں سینکڑوں جگہ "کتاب" کے لفظ سے یاد کرتا ہے۔

کہیں صرف کتاب کہتا ہے۔

۲/۲۳۱ ,۱۵۱ ,۱۰۱ ,۷۹-۷۸/۲ ,۶/۹۲- ۴/۱۴۰ ,۱۳۶ ,۱۲۷

۱۱۳- ۳/۱۶۴, ۲۳,۷ - ۲۸/۸۶ , ۲۰/۲۱,۲۰ - ۱۶/۶۴

۱۵/۱ - ۱۴/۱ , ۷/۱۹۶,۲ - ۶۳/۳ , ۳۶/۱۲,۲-۴۵/۲

۴۰/۱ , ۳۹/۱ , ۲۹/۴۷ ,۵۱

کہیں اپنے آپ کو کتاب مبین کہتا ہے۔ ملاحظہ ہو!

۳۶/۶۹ , ۳۸/۲, ۲۷/۱, ۲۶/۱ , ۳۱/۱ , ۵/۱۵

۴۴/۲ , ۴۳/۲

کہیں اپنے آپ کو کتاب بالحق کہتا ہے دیکھئے

۱۶/۳۲, ۱۳/۱ , ۵/۴۸ , ۴/۱۰۵ , ۳/۳ , ۲/۱۷۶

کہیں الکتاب مفصلاً کہتا ہے دیکھئے ۶/۱۱۴

کہیں کتاب انزلنہ مبارک کہتا ہے ۳۸/۲۹, ۶/۱۱۵

کہیں کتاب الحکیم کہتا ہے دیکھئے ۳۱/۲،۱ , ۱۰/۱

کہیں کتاب لاریب فیہ کہتا ہے ۳۲/۲، ۱۰/۳۷ , ۲/۲

کہیں کتاب الحکمت آیتہ کہتا ہے دیکھئے ۴۱/۲ , ۱۱/۱

کہیں کتاب عزیز کہتا ہے۔ دیکھئے ۴۱/۴۱

کہیں احسنا الحدیث کتابا متشابہا مثانی کہتا ہے ۳۹ / ۲۹

ان مختلف عنوانوں اور مختلف صفات کے ساتھ وہ اپنے آپ کو کتاب کہتا ہے۔ ان مختلف عنوانات وصفات سے بحث کرنے کے لئے اس وقت نہ گنجائش ہے اور نہ ہی ضرورت۔ آپ صرف اتنا دیکھیے کہ قرآن اپنے آپ کو کتاب کہتا ہے (کتاب کا صحیح مفہوم اپنے ذہن میں رکھئے) ما جس میں شیرازہ بندی کا مفہوم داخل ہے۔ لہذا یقیناً نزولِ قرآن ہی کے وقت سے قرآنِ کریم ایسی صورت اختیار کرتا جارہا تھا جس پر کتاب کا لفظ صادق آسکے۔ پھر وہ اپنے آپ کو ایک ایسی کتاب کہتا ہے۔ جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور ہم آپ کو پہلے بتا چکے ہیں کہ قرآن کی نگاہ میں اگر کوئی چیز لکھی ہوئی نہ ہو۔ چاہے وہ چھوٹی ہو یا بڑی تو اللہ کے نزدیک نہ تو وہ صحیح تر ہے اور نہ شہادت کے لئے استوار تر ہے۔ اور نہ ہی شک و شبہ سے بعید تر۔ ظاہر ہے کہ جب قرآن اپنے لئے یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور خود ہی یہ اصول بھی بیان کیا ہے کہ شبہ سے بالاتر وہی چیز ہوسکتی ہے جسے لکھ لیا جائے تو لامحالہ اسے خود اپنے اصول کے مطابق لکھا ہوا ہونا چاہیئے نہ صرف منتشر اوراق پر لکھا ہوا ہو بلکہ (مجموعی شیرازہ بندی) اوراق پر تاکہ اس کو کتاب کہنا صحیح ہو"

(ماخوذ از جمع القرآن از تمنا عمادی صفحہ ۳۸۱-۳۸۰)

یہ تو ہے اللہ تعالیٰ کا پہلا تعارف قرآنِ کریم کے متعلق کہ یہ ایک "کتاب" ہے جس کو اس نے نازل کیا ہے اور اس کے متعلق کہا کہ اس کی حفاظت کا ذمہ بھی اسی نے لیا ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۱۵/۹

قرآنِ کریم کے خلاف سب سے پہلی سازش جو کی گئی وہ یہ تھی کہ یہ عقیدہ پھیلایا گیا اور اس کو مسلمانوں میں عام کیا گیا اور اس کا خوب ڈھنڈورا پیٹا گیا کہ قرآنِ کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں "کتابی" شکل میں موجود ہی نہ تھا بلکہ یہ مختلف ادوار میں مختلف اطوار سے "کتابی" شکل میں جمع کیا گیا اور اس کی قطعیت کو مشکوک کرنے کے لئے مختلف روایات اور قصے کہانیاں وضع کی گئیں جو آج ہمارے اسلامی لٹریچر کا ایک مقدس حصہ ہیں۔ جس کے متعلق ایک اقتباس مندرجہ ذیل ہے۔

" الدیر عاقولی اپنی کتاب الفوائد میں کہتا ہے " حدثنا ابراہیم بن بشار۔ حدثنا سفیان بن عینیہ۔ عن الزہری۔ عن عبید اور عبید زید بن ثابت سے روایت کرتا ہے کہ انہوں نے کہا " نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے اور اس وقت تک قرآن کسی چیز میں جمع نہیں کیا گیا تھا۔ الخطابی کا قول ہے " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو مصحف میں اس واسطے جمع نہیں فرمایا کہ آپ کو اس کے بعض احکام یا تلاوت کے لنسخ کرنے والے حکم کے نزول کا انتظار باقی تھا۔ مگر جب سرورِ عالم کی وفات کے باعث قرآن کا نزول ختم ہو گیا تو خدا نے اپنے اس سچے وعدہ کو وفا کرنے کے لئے جو ان سے اس امت کی حفاظت کے متعلق فرمایا تھا۔ خلفائے راشدین کے دل میں یہ بات (قرآن کو جمع کرنے کی خواہش) ڈالی۔ پھر اس عظیم الشان کام کا آغاز عمرؓ کے مشورہ کے مطابق ابوبکرؓ کے ہاتھوں سے ہوا "

(الاتقان فی علوم القرآن از علامہ جلال الدین سیوطی صفحہ ۱۵۳)

اس عقیدے پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ تمنا عمادی لکھتے ہیں:۔

" جلال الدین سیوطی وغیرہ کے نزدیک پورا قرآن نہ کتابی شکل میں کہیں مجتمع تھا نہ پورا قرآن محدثین کے نزدیک کبھی بھی کسی کے پاس مجتمع نہ تھا۔ کسی کو یاد تھا اور نہ ہڈی، لکڑی، چھال یا کھال وغیرہ پر آیاتِ منتشرہ ہی کی صورت میں پورا قرآن کسی جگہ

بھی یکجا تھا۔ کوئی سورہ کسی کو یاد تھا کوئی کسی کو۔ کچھ آئتیں کسی کو حفظ تھیں کچھ کسی کو۔ لکھی ہوئی بعض آئتیں یا سورتیں ایسی نہ تھیں جو صرف ایک ہی شخص کے پاس تھیں۔

حضرت ابوبکرؓ نے زید بن ثابتؓ سے لکھواکر اکٹھا کرا کے منتشر آیات سے سورتیں مرتب کرالیں اور متعدد صحیفوں میں ان سب سورتوں کو لکھوالیا اور لکھواکر تبرکات کی طرح ان کو اپنی پوری زندگی تک مقفل رکھا۔ نہ اس کی متعدد نقلیں کرا کے مختلف اطراف وجوانب میں بھیجیں نہ عام مسلمانوں، نہ خاص مہاجرین والصارؓ ہی کو اس کا حکم دیا کہ اب ان صحیفوں سے ہر کتاب جاننے والا نقلیں کر کے اپنی تلاوت کے لئے اپنے پاس رکھ لے۔ غرض جمع صدیقی سے حضرت عمرؓ کے بعد تک یعنی نقل مصاحف بعہد عثمانی سے قبل تک کسی شخص نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ یہاں تک کہ خود حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ بلکہ زید بن ثابتؓ کا بھی ان صحیفوں میں تلاوت کرنا یا اس سے کچھ فائدہ اٹھانا ثابت نہیں ہوتا۔ تقریباً اٹھارہ سال تک یہ صحیفے بے کار مقفل رکھے رہے۔ اٹھارہ برس کے بعد پہلے پہل جو ان صحیفوں سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے تو یہی کہ حضرت عثمانؓ نے اس کی چند نقلیں کرا کے مختلف اطراف وجوانب میں بھیجیں تو نقل مصاحفِ عثمانی سے پہلے تک تو جس طرح آیاتِ قرآنی منتشر اور سورتیں بالکل غیر مرتب تھیں اور پورا قرآن کسی ایک کے بھی سینے یا سفینے میں مرتب ومدوّن اور محفوظ نہ تھا۔ بالکل اسی حال میں نقل مصاحف بعہدِ عثمانی سے قبل تک قرآن پاک رہا اور لوگ نمازوں میں تلاوتوں میں اور بعہد حضرت عمرؓ تراویح میں غیر مرتب اور ناقص ہی قرآن پڑھتے رہے۔ اس لیے کہ جمع صدیقی والے صحیفوں کے سوا پورا قرآن تو کسی ایک شخص کے پاس بھی موجود نہ تھا۔ نہ کسی کے سینے میں نہ کسی کے سفینے میں، اور وہ جمع صدیقی والے صحیفے بھی حضرت صدیق اکبرؓ ان کے بعد جمع صدیقی والے صحیفے بھی مقفل ہی رہے۔ کسی نے ان سے کبھی کوئی فائدہ

نہ اٹھایا۔

حضرت فاروقِ اعظم اور ان کے بعد امیر المومنین حضرت حفصہ کے پاس مقفل "کتاب مکنون" کے مصداق بنے ہر شخص کی نظر سے پوشیدہ رکھے رہے۔ تو کیا کسی صاحبِ عقل و ہوش کی عقل و دیانت یہ تسلیم کر سکتی ہے کہ عہدِ نبوی عہدِ صدیقی، عہدِ فاروقی اور آغازِ عہدِ عثمانی یعنی نقلِ مصاحف سے قبل تک کسی فردِ مسلم نے پورا قرآن ایک مصحف کی صورت میں اوّل سے آخر تک نہ کبھی دیکھا تھا نہ کبھی پڑھا تھا اور نہ کوئی شخص پورے قرآن کا حافظ تھا۔

(جمع القرآن از تمنا عمادی۔ الرحمان پبلشنگ ٹرسٹ بلاک ناظم آباد کراچی ص ۲۸۷ تا ۲۸۵)

اس سلسلے میں صحیح بخاری کی احادیث ملاحظہ فرمائیں۔

• ہم سے موسیٰ بن اسماعیل نے حدیث بیان کی۔ ان سے ابراہیم بن سعد نے حدیث بیان کی ان سے ابنِ شہاب نے حدیث بیان کی ان سے عبید بن سباق نے اور ان سے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ جنگ یمامہ میں (صحابہ کی بہت بڑی تعداد کے) شہید ہو جانے کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھے بلا بھیجا۔ اس وقت عمر رضی اللہ عنہ بھی آپ کے پاس موجود تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عمر میرے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ یمامہ کی جنگ میں بہت بڑی تعداد میں قرآن کے قاریوں کی شہادت ہو گئی ہے اور مجھے ڈر ہے کہ اس طرح کفار کے ساتھ دوسری جنگوں میں بھی قراء قرآن بڑی تعداد میں قتل ہو جائیں گے اور یوں قرآن کے جاننے والوں کی بہت بڑی تعداد ختم ہو جائے گی۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ آپ قرآن مجید کو (باقاعدہ صحیفوں میں) جمع کرنے کا حکم دے دیں گے۔ میں نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ ایک ایسا کام کس طرح کریں گے جو

جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اپنی زندگی میں) نہیں کیا! عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا جواب یہ دیا کہ اللہ گواہ ہے یہ تو ایک کارِ خیر ہے۔ عمرؓ یہ بات مجھ سے مسلسل کہتے رہے اور آخر اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں مجھے بھی شرحِ صدر عطا فرمایا اور اب میری بھی وہی رائے ہو گئی ہے جو عمر رضی اللہ عنہٗ کی ہے۔ زید رضی اللہ عنہٗ نے بیان کیا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہٗ نے فرمایا کہ آپ (زید رضی اللہ عنہٗ) جوان اور عقل مند ہیں۔ آپ کو معاملہ میں متہم بھی نہیں کیا جا سکتا اور آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی بھی لکھتے تھے۔ اس لئے آپ قرآنِ مجید کو پوری تلاش اور عرق ریزی کے ساتھ ایک جگہ جمع کر دیجئے۔ اللہ گواہ ہے اگر لوگ مجھے کسی پہاڑ کو بھی اس کی جگہ سے دوسری جگہ ہٹانے کے لئے کہتے تو میرے لئے یہ کام اتنا اہم نہیں تھا جتنا کہ ان کا یہ حکم کہ میں قرآنِ مجید کو جمع کر دوں۔ میں نے اس پر کہا کہ آپ لوگ ایک ایسے کام کو کرنے کی ہمت کیسے کر سکتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نہیں کیا تھا؟ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اللہ گواہ ہے یہ ایک عمل خیر ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہٗ یہ جملہ برابر دھراتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی ان کی اور عمر رضی اللہ عنہما کی طرح شرحِ صدر عنایت فرمایا۔ چنانچہ میں نے قرآنِ مجید (جو مختلف چیزوں پر لکھا ہوا موجود تھا) کی تلاش شروع کی اور قرآنِ مجید کو کھجور کی چھلی ہوئی شاخوں، پتلے پتھروں سے (جن پر اس زمانہ میں لکھا جاتا تھا اور جن پر قرآنِ مجید بھی لکھا گیا تھا اور لوگوں کے سینوں (قرآن کے حافظوں کے حافظہ) کی مدد سے جمع کرنے لگا۔ سورہ توبہ کی آخری آیتیں مجھے ابوخزیمہ انصاری رضی اللہ عنہٗ کے پاس لکھی ہوئی ملیں۔ یہ چند آیات مکتوب شکل میں ان کے سوا اور کسی کے پاس نہیں تھیں وہ آیتیں "لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ" سے سورۂ براءۃ (توبہ) کے خاتمہ تک۔ جمع کے بعد قرآنِ مجید کے صحیفے ابوبکر رضی اللہ عنہٗ کے پاس محفوظ تھے۔ پھر ان کی وفات کے بعد عمر رضی اللہ عنہٗ

نے جب تک وہ زندہ رہے اپنے ساتھ رکھا۔ پھر وہ ام المومنین حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہما کے پاس محفوظ رہے۔

(صحیح بخاری جلد دوم صہ ۱۱۱۸-۱۱۱۷ حدیث نمبر ۲۹۵۔ شائع کردہ دارالاشاعت اردو بازار کراچی)

مندرجہ بالا حدیث میں یہ بات زور دے کر کہی گئی ہے کہ قرآنِ کریم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کتابی شکل میں مرتب و مدوّن نہیں ہوا تھا۔ میری اپنی رائے کے مطابق یہ قرآنِ کریم کے خلاف سب سے پہلی سازش تھی۔ اس کو ثابت کرنے کے لیے مندرجہ ذیل مفصل دلائل سے بھرپور حوالہ ملاحظہ فرمائیں جو علامہ تمنا عمادی صاحب نے پیش کیا ہے:۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ علم کی دنیا میں یقینی شئے اسی کو کہا جاسکتا ہے جو قیدِ کتابت میں آجائے۔ چنانچہ خود عربوں کے ہاں یہ ضرب المثل موجود ہے "العلم صید والکتابۃ قید" علم ایک وحشی شکار کی طرح ہے اس کو لکھ کر ہی محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو لکھی ہوئی شکل میں امت کو دیا تھا یا نہیں۔

قرآن نے لکھنے پڑھنے پر کتنا زور دیا ہے یہ محتاجِ بیان نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جو سب سے پہلے وحی آئی ہے اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے فرمایا گیا ہے۔

اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (۹۶/۵،۳)

"اے پیغمبر! پڑھ، تیرا پروردگار نہایت ہی کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا اور اس طرح انسان کو وہ کچھ سکھا دیا۔ جو وہ نہیں جانتا تھا۔

دوسری جگہ: نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ

ہم شہادت پیش کرتے ہیں قلم کی اور اس کی جو کچھ وہ لکھتے ہیں۔

فرما کر کتابت و تحریر کی اہمیت کو واضح تر کر دیا۔ قرآن نے بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی لکھ لینے کو ضروری قرار دیا ہے۔ کیونکہ جو بات لکھی ہوئی نہ ہو بلکہ محض لوگوں کی زبانی نقل در نقل ہوتی آ رہی ہو وہ نہ اللہ کے نزدیک صحیح تر ہے نہ ہی شہادت کیلئے استوار تر۔ بلکہ محل شک و شبہ بن جاتی ہے چنانچہ حکم ہے

یا ایھا الذین امنوا اذا تداینتم بدین الی اجل مسمی فاکتبوہ ولا تسئموا ان تکتبوہ صغیرا او کبیرا الی اجلہ ذالکم اقسط عند اللہ واقوم للشھادۃ وادنی ان لا ترتابوا (۲/ ۲۸۲)

اے پیروان دعوت ایمانی! جب کبھی آپس میں قرض کا لین دین کسی وقت مقررہ تک کرو تو اس کو لکھ لیا کرو۔ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو۔ اس کو اس کی میعاد تک لکھ لینے میں سستی نہ کیا کرو کیونکہ لکھ لینا ہی اللہ کے نزدیک صحت کی بڑی ضمانت اور گواہی کے لیے بڑی استواری کا باعث اور شکوک و شبہات سے بالاتر ہے۔

ظاہر ہے کہ قرض کا لین دین محض ایک باہمی معاملہ کی بات ہے۔ اس کے برخلاف قرآن کا معاملہ بالکل دین کا بلکہ دین کی بنیاد کا معاملہ ہے۔ اگر چھوٹا یا بڑا قرضہ دستاویز نہ لکھنے کی وجہ سے اللہ کے نزدیک صحت سے دور شہادت کے لئے نا استوار اور محل شبہ قرار پا سکتا ہے تو قرآن کا نہ لکھا جانا اور محض زبانی نقل پر اکتفا کر لینا کیسے جائز ہو سکتا تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلی ہی وحی میں قرآت اور قلم کی طرف متوجہ کر دیا گیا کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منصب رسالت پر فائز ہونے تک لکھنے پڑھنے سے نا آشنا تھے۔ حق تعالیٰ کی طرف سے اس راہنمائی کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ شبہ کرنا بھی بہت بڑی جسارت ہے کہ آپ نے حق تعالیٰ کی اس راہنمائی سے خود فائدہ نہیں اٹھایا ہوگا۔ اس راہنمائی کے بعد یقیناً آپ نے

لکھنا پڑھنا سیکھا ہوگا۔ بہرحال اتنی بات تو یقینی ہے کہ منصب رسالت پر فائز ہو جانے کے بعد آپ اُمّی نہیں رہے تھے۔

و ما کنت تتلو من قبلہ من کتٰب ولا تخطہ بیمینک اذا لارتاب المبطلون ۲۹/۴۸

اور اے پیغمبر، تم قرآن کے نازل ہونے سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھ سکتے تھے اور نہ ہی اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکتے تھے (اگر ایسا ہوتا) پھر تو باطل پرست لوگ ضرور شبہ کر سکتے تھے۔

یہاں قرآنِ کریم نے کتابیں پڑھ سکنے اور اپنے ہاتھ سے لکھ سکنے کی نفی صرف نزولِ قرآن سے پہلے زمانہ کے لئے کی ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ نزولِ قرآن کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم بخوبی لکھ پڑھ سکتے تھے۔ ورنہ "من قبلہ" کے لفظ سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ لفظ بالکل بے کار ہو جاتا ہے اس صورت میں ماکنت تتلو من کتٰب ولا تخطہ بیمینک کافی تھا۔ معلوم نہیں یہ خیال کہاں سے پیدا کر لیا گیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آخر عمر تک لکھنے پڑھنے سے ناآشنا رہے ہے۔ حیرت ہے کہ حضرت زید ابنِ ثابتؓ عبرانی زبان سیکھنا چاہیں تو ہفتہ بھر میں عبرانی جیسی ایک غیر زبان سیکھ کر عبرانی زبان میں خطوط لکھنے پڑھنے کے قابل ہو سکتے ہوں مگر محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا ذہین شخص جس کی ذہانت یقیناً حضرت زیدؓ سے بڑھ کر تھی۔ اس کے متعلق یہ خیال کر لیا جائے کہ وہ تادمِ وفات اَن پڑھ ہی رہا۔

قرآن کی اس واضح شہادت کے بعد ہم اس غلط خیال کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں دیکھتے۔ قرآن اتنا ہی نہیں کہتا بلکہ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ وحی نازل ہونے کے بعد اوّل آپ اس کو خود قلم بند فرما لیا کرتے تھے اور اس کے بعد دوسرے صحابہ

کو لکھوا دیا کرتے تھے اور ایسا عموماً بالالتزام ہوتا رہتا تھا۔ ملاحظہ ہو :-

وقالوا اساطیر الاولین اکتتبها فهی تملٰی علیه بکرة واصیلا ۲۵/۵

مشرکین کہتے ہیں (قرآن اس کے سوا کیا ہے) پچھلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جو اس (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود لکھ لی ہیں اور وہی اس کے سامنے دن رات لکھوائی جاتی رہتی ہیں۔

اکتتب کے معنی ہیں کہ انسان خود لکھے بلکہ یہ بھی کہ دوسرا بول رہا ہو اور یہ خود لکھ رہا ہو۔

(جمع القرآن از تمنا عمادی صہ ۳۷۹ - ۳۷۶)

یہ جو صحیح بخاری کی حدیث میں آیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے زید بن ثابت کو بلا کر کہا کہ وہ قرآن کو ایک کتابی شکل میں جمع کریں اور حضرت عمرؓ جو وہاں موجود تھے، نے فرمایا کہ آپ یہ کام کس طرح کریں گے۔ جس کو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ اس کے متعلق علامہ تمنا عمادی لکھتے ہیں :

"متن حدیث میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ سے حضرت عمرؓ نے اور پھر جب حضرت ابوبکرؓ نے زید بن ثابتؓ سے کہا تو حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے اور زید بن ثابتؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ "ایسا کام کس طرح کرو گے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا" سوال یہ ہے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن نہیں لکھوایا تھا؟ پھر حضرت ابوبکرؓ نے زید بن ثابتؓ سے یہ کیوں کہا کہ "تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وحی لکھا کرتے تھے" وہ وحی کیا تھی؟ کیا قرآن کے سوا کچھ اور بھی تھا؟"

کہا جاتا ہے کہ اس وقت کاغذ یا کاغذ کی طرح کی کوئی چیز نہ تھی جس پر

کتاب کی صورت میں قرآن لکھا جاتا۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہڈی، چھال
کھال، تختی، پتھر اور ٹھیکری وغیرہ پر قرآن لکھواتے تھے اور لکھنے پڑھنے کا اس وقت
عام عرب اور مکہ مدینہ میں بھی رواج ہی بہت کم تھا۔ صرف چند گنتی کے آدمی لکھنا پڑھنا
جانتے تھے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ کتابی صورت میں قرآن نہیں لکھوایا
تھا اور حضرت ابوبکرؓ کتابی صورت میں لکھنے کے لیے زید بن ثابت سے کہہ رہے
تھے اور ان سے پہلے حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا تھا اس لئے یہ کہا گیا
کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ تم کس طرح کرو گے؟ تو یہ بالکل
غلط اور جھوٹا پروپیگنڈہ ہے۔ صرف اسی جھوٹی حدیث کی بنا پر محض خلافِ واقعہ
مشہور کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کتابی صورت میں نہیں لکھوایا تھا
بلکہ ہڈی کھال چھال، تختی، پتھر اور ٹھیکری وغیرہ پر لکھوایا تھا اور اس کی وجہ یہ بتائی
کہ چونکہ اس وقت عرب میں کاغذ نہیں ملتا تھا۔ معلوم نہیں ایسا سفید جھوٹ کس طرح
سچ اور بالکل صحیح سمجھ لیا گیا ہے کہ ساری اسلامی تاریخ اس سے بھری پڑی ہے اور
ہر مصنف اس کو دہرائے جاتا ہے یہ کوئی نہیں سوچتا کہ آخر عرب میں بعثت سے
پہلے اہلِ کتاب رہتے تھے ان کے پاس ان کی کتابیں تھیں اور لوگ اپنے ہاتھوں سے
لکھ لکھ کر لوگوں میں پھیلاتے تھے۔

یکتبون الکتاب بایدیھم جس کی شہادت قرآن ہی میں موجود ہے۔
آخر تورات وانجیل اور زبور کس چیز پر لکھی جاتی تھیں۔ سو سو اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو شعروں
کے قصائد جو لکھ لکھ کر شعراء خانہ کعبہ سے لگاتے تھے وہ کس چیز پہ لکھتے تھے اور جب
سارا عرب سوائے چند ایک کے ان پڑھ ہی تھا تو کس کے لئے یہ قصائد لکھے جاتے
تھے؟ اور اہلِ کتاب جو اپنے ہاتھ سے لکھ لکھ کر شائع کرتے تھے وہ کس کے لیے؟
اور کس چیز پر؟ (علامہ تمنا عمادی جمع القرآن صہ ۱۸۷-۱۸۶)

حضرت زید بن ثابت رض کو صحیح بخاری کی روایت میں کاتب وحی قرار دیا گیا ہے
اس پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ تمنا عمادی لکھتے ہیں:

" زید بن ثابت رض (متوفی ۴۵ھ یا ۴۸ھ)، ہجرت کے وقت گیارہ برس کے تھے۔ قرآن مجید کی کچھ سورتیں یاد کر لی تھیں۔ اس لئے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینے پہنچے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کئے گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دیکھ کر خوش ہوئے۔ ۲ھ میں اسارائے جنگ بدر سے کتابت سیکھنا شروع کی تھی۔ یقیناً مشق کتابت ومہارتِ املاء میں تین چار سال سے کم نہیں لگے ہوں گے۔ تیرہ سال تک مکہ مکرمہ میں دوسرے ہی لوگ کتابتِ وحی کرتے رہے تھے اور پھر ہجرت کے بعد زید بن ثابت رض کی تعلیم کتابت ومشق مہارتِ املاء تک بھی دوسرے ہی لوگ کتابتِ وحی کرتے رہے۔ جب ان کو مشق کتابت ومہارتِ املاء حاصل ہو چکی تو غالباً ۶ھ یا ۷ھ ہجری یا اس کے بھی بعد سے زیادہ سے زیادہ آخری تین چار سال کی مدت میں جو کچھ بھی وحی آئی، اس کو زید بن ثابت رض نے بھی لکھا ہوگا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی دوسرے سے اس مدت میں کتابتِ وحی کا کام لیا ہی نہیں گیا۔ جہاں زید بن ثابت رض اس مدت میں لکھنے والے تھے وہاں اور دوسرے لوگ بھی تھے۔ کیونکہ ان سے پیشتر کے لکھنے والے بالکل معزول نہیں کر دیئے گئے تھے اور نہ ان پر ان کو کوئی وجہ ترجیح پیدا ہو گئی تھی بلکہ کتاب نیل الاوطار جلد، صفحہ ۵۳۸ میں ہے:

فی حدیث زید بن ثابت ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم امرہ
فتعلم کتاب الیھود وقال کتبت للنبی صلی اللہ علیہ وسلم
کتبہ واقراتہ کتبھم اذا کتبوا الیہ۔ رواہ احمد وبخاری

یعنی زید بن ثابت رض کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا تھا تو انہوں نے یہودیوں کی زبان سریانی کی قرأت اور کتابت سیکھی۔ زید بن ثابت رض

نے کہا کہ یہاں تک کہ (میں نے اس بات میں مہارت پیدا کرلی) اور میں لکھتا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مراسلات (سریانی زبان میں ترجمہ کرکے سریانی رسم الخط میں)، اور آپؐ کے سامنے پڑھتا۔ یہودیوں کے مراسلات جب وہ بھیجتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس حدیث کو امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں اور امام بخاری نے روایت کیا ہے۔ اس کے کچھ بعد علامہ شوکانی لکھتے ہیں۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کے بعد جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ثابت کو دیکھا اور کمسنی ہی میں ان کی ذہانت وحفظ کا اندازہ لگایا تو اسی وقت ان کو سریانی زبان اور رسم الخط سیکھنے کے لئے فرمایا تھا۔ اور انہوں نے چھ مہینے تک اس حد تک سیکھ لیا کہ مراسلات کا کام کرنے کے قابل ہو گئے۔ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ سریانی زبان عبرانی زبان کے علاوہ ایک دوسری ہی زبان ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوا کہ زید بن ثابتؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب مراسلات تھے اور یہودیوں کے مراسلات کے متعلق خاص کاتب تھے نہ کہ وحی کی کتابت میں ان کی کوئی خاص خصوصیت تھی بلکہ مختلف طرح کی کتابت میں خلط ملط کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ جس وقت کوئی اور کاتب وحی موجود رہتا ہو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے وحی لکھوا لیتے ہوں۔ زید بن ثابتؓ کا مخصوص اور سب سے زیادہ اہم کاتب وحی ہونا صرف بخاری کی حدیث کی وجہ سے مشہور ہو گیا اور اس حدیث کو قوت پہنچانے کے لئے مشہور ہو گیا ہے ورنہ دراصل ان کو اس سلسلے میں کوئی خاص اہمیت نہ تھی اور نہ ہو سکتی ہے اس لئے اس روایت کی وجہ سے پیدا شدہ شہرت کو ان کی خصوصیت کے ثبوت میں پیش کرنا کھلا ہوا مصادرہ علی المطلوب ہے جو کسی صاحب انصاف و دیانت کے نزدیک جائز نہیں۔ محدثین نے اسی روایت سے ان کو وحی کا کاتب قرار دینے کے لئے بہت زور لگایا ہے اور بعض روائتیں بھی اس

کی تائید میں بنالی گئی ہیں مگر درائت صاف بتا رہی ہے کہ یہ سب صرف روایت جمع قرآن کی کھوکھلی دیوار کے لئے کھوکھلے لپشتے ہیں اس کے سوا کچھ نہیں۔

"مصادرہ علی المطلوب" علم مناظرہ کی ایک اصطلاح ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جو دعویٰ ہو اسی کو گھما پھرا کر دلیل میں پیش کیا جائے۔ جس کو دعویٰ ہی قبول نہیں وہ اس دعوے یا اس کے کسی حصے کو دلیل میں کس طرح قبول کر سکتا ہے؟

(از علامہ تمنا عمادی۔ جمع القرآن صـ ۱۵۲-۱۵۱)

اس کے بعد لکھتے ہیں:

ان براعین قاطعہ کے باوجود کیا اس کا گمان بھی کیا جا سکتا ہے کہ قرآن عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع نہیں ہوا تھا اور حضرت عمرؓ کے مشورے سے حضرت ابوبکرؓ ایک اتنے بڑے اہم کام پر آمادہ ہوئے تھے جس میں خود ان کو جھجک تھی اور انہوں نے زید بن ثابتؓ کو بُلا بھیجا اور اتنا بڑا اہم ترین کام صرف انہی کے سپرد کر دیا؟ اور دوسرے کسی صحابی سے مشورہ تک نہ کیا؟

(جمع القرآن صـ ۱۶۰)

صحیح بخاری کی ہی ایک اور روایت ہے جو جمع القرآن کے سلسلہ میں حضرت عثمانؓ سے منسوب ہے۔ روایت مندرجہ ذیل ہے۔

"ہم سے موسیٰ نے حدیث بیان کی۔ ان سے ابراہیم نے حدیث بیان کی۔ ان سے ابن شہاب نے حدیث بیان کی اور ان سے انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان کی کہ حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ، امیر المؤمنین عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ اس وقت عثمان رضی اللہ عنہ ارمینیہ اور آذربیجان کی فتح کے سلسلہ میں شام کے غازیوں کے لیے جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھے تاکہ وہ اہلِ عراق کو ساتھ لے کر جنگ کریں۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ قرآن مجید کی قرأت کے اختلاف کی وجہ سے

بہت پریشان تھے۔ آپ نے عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ امیر المومنین اس سے پہلے کہ یہ امت (مسلمہ) بھی یہودیوں اور نصرانیوں کی طرح کتاب اللہ میں اختلاف کرنے لگے آپ اس کی خبر لیجیے۔ چنانچہ عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے یہاں کہلایا کہ صحیفے (جنہیں زید رضی اللہ عنہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حکم سے جمع کیا تھا اور جن پر مکمل قرآنِ مجید لکھا ہوا تھا) ہمیں دے دیں تاکہ ہم انہیں مصحفوں میں (کتابی شکل میں) نقل کروالیں پھر اصل ہم آپ کو لوٹا دیں گے۔ حفصہ رضی اللہ عنہا نے وہ صحیفے عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیے اور آپ نے زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر، سعید بن العاص، عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ وہ ان صحیفوں کو مصحفوں میں نقل کرلیں۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے اس جماعت کے تین قریشی اصحاب سے فرمایا کہ اگر آپ حضرات کا قرآنِ مجید کے کسی لفظ کے سلسلہ میں زید رضی اللہ عنہ سے اختلاف ہو تو اسے قریش کی زبان کے مطابق لکھ لیں کیونکہ قرآنِ مجید نازل بھی قریش ہی کی زبان میں ہوا تھا۔ چنانچہ ان حضرات نے ایسا ہی کیا اور جب تمام صحیفے مختلف مصاحف میں نقل کرلیے گئے تو عثمان رضی اللہ عنہ نے ان صحیفوں کو حفصہ رضی اللہ عنہا کو واپس لوٹا دیا اور اپنی سلطنت کے ہر علاقہ میں نقل شدہ مصحف کا ایک ایک نسخہ بھجوا دیا اور حکم دیا کہ اس کے سوا کوئی چیز اگر قرآن کی طرف منسوب کی جاتی ہے خواہ وہ کسی صحیفہ یا مصحف میں ہو تو اسے جلا دیا جائے۔ ابن شہاب نے بیان کیا کہ مجھے خارجہ بن زید بن ثابت نے خبر دی انہوں نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے سنا آپ نے بیان کیا کہ جب ہم (عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں) مصحف کی صورت میں قرآنِ مجید کو نقل کر رہے تھے تو مجھے سورۂ احزاب کی ایک آیت نہیں ملی۔ حالانکہ میں اس آیت کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کرتا تھا اور آپ اس کی تلاوت کیا کرتے

تھے۔ پھر ہم نے اسے تلاش کیا تو وہ خزیمہ بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس ملی۔ وہ آیت یہ تھی ۰ من المومنین رجالاً صدقوا ما عاہدوا اللہ علیہ۔ چنانچہ ہم نے یہ آیت اس کی صورت میں مصحف میں لکھ دی۔

(صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۱۱۱۹-۱۱۱۸۔ حدیث نمبر ۲۰۹۶ شائع کردہ دارالاشاعت اردو بازار کراچی)

صحیح بخاری کی ایک اور حدیث کہ قرآن سات طریقوں سے نازل ہوا۔ پس تمہیں چاہیئے کہ جس طرح آسان ہو پڑھو۔

ملاحظہ فرمائیں!

"ہم سے سعید بن عفیر نے حدیث بیان کی، کہاکہ مجھ سے لیث نے حدیث بیان کی، کہاکہ مجھ سے عقیل نے حدیث بیان کی اور ان سے ابن شہاب نے بیان کیا ان سے عروہ بن زبیر نے حدیث بیان کی اور ان سے مسور بن مخرمہ اور عبدالرحمٰن بن عبدالقاری نے حدیث بیان کی۔ انہوں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے سنا۔ آپ بیان کرتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں میں نے ہشام بن حکیم کو سورہ فرقان نماز میں پڑھتے سنا۔ میں نے ان کی قرأت کو غور سے سنا تو معلوم ہوا کہ وہ سورت دوسرے طریقے سے پڑھ رہے ہیں۔ حالانکہ مجھے اس طرح آنحضورؐ نے نہیں پڑھایا تھا۔ قریب تھا کہ میں ان کا سر نماز ہی میں پکڑ لیتا لیکن میں نے بڑی مشکل سے صبر کیا اور جب انہوں نے سلام پھیرا تو میں نے ان کی چادر سے ان کی گردن باندھ کر پوچھا یہ جو میں نے ابھی تمہیں پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ تمہیں کس نے اس طرح پڑھائی ہے؟ انہوں نے کہاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اسی طرح پڑھائی ہے۔ میں نے کہا تم جھوٹ بولتے ہو۔ خود حضور اکرمؐ نے مجھے اس سے مختلف دوسرے طریقہ سے پڑھائی جس طرح تم پڑھ رہے تھے

بالآخر میں انہیں کھینچتا ہوا حضورِ اکرم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ میں نے اس شخص سے سورہ فرقان ایسے طریقوں سے پڑھتے سُنی جن کی آپ نے مجھے تعلیم نہیں دی ہے۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا پہلے انہیں چھوڑ دو۔ ہشام! پڑھ کر سناؤ۔ انہوں نے آنحضورؐ کے سامنے بھی اسی طرح پڑھا۔ جس طرح میں نے انہیں نماز میں پڑھتے سنا تھا۔ آنحضورؐ نے یہ سُن کر فرمایا کہ یہ سورت اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ پھر فرمایا عمر! اب تم پڑھ کر سناؤ۔ میں نے اسی طرح پڑھا جس طرح آنحضورؐ نے مجھے تعلیم دی تھی۔ آنحضورؐ نے اسے بھی سنکر فرمایا کہ اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ یہ قرآن سات طریقوں سے نازل ہوا ہے۔ پس تمہیں جس طرح آسان ہو پڑھو۔

(صحیح بخاری جلد دوم صہ ۱۱۲۱- ۱۱۲۰ حدیث نمبر ۲۱۰۰)

اسی سلسلے میں علامہ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں :-

" موسیٰ بن عقبہ کی کتاب المغازی میں ابنِ شہاب سے روایت کی گئی ہے کہ اس نے کہا " جس وقت جنگ یمامہ میں مسلمانوں کا بہت کچھ نقصان جان ہوا تو ابوبکرؓ نہایت پریشان ہوئے اور وہ ڈرے کہ کہیں صحابہ کی شہادت سے قرآن کا کوئی حصّہ تلف نہ ہو جائے۔ پھر سب لوگ جو کچھ قرآن ان کے پاس تھا یا انہیں یاد تھا لے کر آنے لگے۔ یہاں تک کہ ابوبکرؓ کے زمانہ میں وہ اوراق میں جمع کر لیا گیا۔ اس لحاظ سے ابوبکرؓ پہلے شخص تھے جنہوں نے قرآن کو مصحف میں جمع کیا۔ ابنِ حجر کا قول ہے اور عمارہ بن عزیہ کی روایت میں آیا ہے کہ زید بن ثابتؓ نے کہا۔ پھر مجھ کو ابوبکرؓ نے حکم دیا اور میں نے قرآن کو کھال کے ٹکڑوں اور کھجور کی شاخ کے ڈنٹھلوں میں لکھا۔ پھر جس وقت ابوبکرؓ وفات پا گئے اور عمرؓ کا زمانہ آیا تو پھر میں نے قرآن کو ایک ہی صحیفہ (ورق) میں لکھا۔ اور یہ (قرآن مکتوب) عمرؓ کے پاس موجود رہا" ابنِ حجر کہتا ہے۔ اور زیادہ صحیح پہلی

ہی بات ہے۔ اس لئے کہ کھال کے ٹکڑوں اور شاخ خرما کے ڈنٹھلوں پر تو اس سے پہلے ہی قرآن لکھا ہوا تھا جب کہ وہ ابوبکرؓ کے زمانہ میں جمع کیا گیا ہے۔ جس پر مترادف صحیح حدیثیں دلالت کر رہی ہیں۔

حاکم کا بیان ہے "اور تیسری مرتبہ قرآن کا جمع کیا جانا یہ تھا کہ عثمان کے عہد میں سورتوں کی ترتیب ہوئی۔ بخاری نے انسؓ سے روایت کی ہے۔ حذیفہ بن الیمانؓ عثمانؓ کے پاس آئے اور ارمینیہ اور آذربائیجان کے فتوحات میں اہل شام، عراق والوں کے ساتھ مل کر معرکہ آرائی میں شریک تھے۔ حذیفہؓ کو ان دونوں ممالک کے مسلمانوں کا قرأت میں اختلاف رکھنا سخت پریشان بنا چکا تھا۔ اس لئے انہوں نے عثمانؓ سے کہا "تم امت کی اس بات سے پہلے ہی خبر لے لو۔ جب کہ وہ یہود و نصاریٰ کی طرح باہم اختلاف رکھنے والی بن جائے" عثمانؓ نے یہ بات سنکر بی بی حفصہؓ کے پاس کہلا بھیجا کہ جو صحیفے آپ کے پاس امانتاً رکھے ہیں۔ انہیں بھیج دیجئے تاکہ میں ان کو مصحفوں میں نقل کرانے کے بعد پھر آپ کے پاس واپس ارسال کر دوں۔ بی بی صاحبہؓ نے وہ صحائف عثمانؓ کو بھجوا دیئے۔ اور عثمانؓ نے زید بن ثابتؓ۔ عبداللہ بن زبیرؓ۔ سعید بن العاصؓ اور عبدالرحمٰن بن الحارثؓ بن ہشام کو ان کے نقل کرنے پر مامور کیا۔ اور تینوں قریشی صاحبوں سے کہا کہ جہاں کہیں قرآن کے تلفظ میں تمہارے اور زید بن ثابتؓ کے مابین اختلاف آپڑے وہاں اس لفظ کو خاص قریش ہی کی زبان میں لکھنا کیوں کہ قرآن انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے" چنانچہ ان چاروں صاحبوں نے مل کر عثمانؓ کے حکم کی تعمیل کی اور جب وہ ان صحیفوں کو مصاحف میں نقل کر کے لکھ چکے تو عثمانؓ نے وہ صحائف بدستور بی بی حفصہؓ کے پاس واپس بھیج دیئے اور اپنے لکھوائے ہوئے مصحفوں میں سے ایک ایک مصحف ممالک اسلامیہ کے ہر ایک گوشے میں ارسال کر دیا اور حکم دیا کہ اس مصحف کے سوا اور

جس قدر صحیفے یا مصحف پہلے کے موجود ہوں ان کو سوخت کر دیا جائے۔ زیدؓ کہتے ہیں "جس وقت ہم نے مصحف کو لکھا تو سورۃ الاحزاب کی ایک آیت ہمیں نہیں ملی۔ جس کو میں رسول اللہ صلعم کو پڑھتے سنا کرتا تھا۔ پھر ہم نے اس آیت کو خزیمہ بن ثابت الانصاری کے پاس پایا۔ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ الآیۃ۔ چنانچہ ہم نے اس آیت کو اس کی سورت کے اندر اپنے مصحف میں شامل کر دیا" ابن حجر کا قول ہے "یہ کاروائی ۲۵ھ میں ہوئی تھی اور بعض ایسے لوگ جن کو ہم نے پایا ہے انہوں نے بھول کر یہ بات کہی کہ اس بات کا وقوع ۳۰ھ کے حدود میں ہُوا تھا مگر انہوں نے اپنے اس قول کا کوئی اسناد بیان نہیں کیا۔ ابن اشتہ نے ایوب کے طریق پر ابی کلابہؓ سے روائت کی ہے کہ اس نے کہا۔ مجھ سے انس بن مالک نامی بنی عامر کے ایک شخص نے بیان کیا کہ عثمانؓ کے عہد میں قرآن کے اندر اس قدر اختلاف پڑ گیا جس کی وجہ سے پڑھنے والے بچوں اور معلم لوگوں کے مابین تلوار چل گئی۔ عثمانؓ کو یہ خبر پہنچی تو انہوں نے فرمایا "لوگ میرے سامنے ہی قرآن کو جھٹلانے اور اس میں غلطی کرنے لگے تو غالباً جو مجھ سے دُور ہوں گے وہ ان کی نسبت سے کہیں بڑھ کر جھٹلاتے اور غلطیاں کرتے ہوں گے۔ اے اصحاب محمد صلعم تم مجتمع ہو جاؤ اور لوگوں کے لئے ایک امام (قرآن) لکھو" چنانچہ تمام صحابہؓ نے متفق ہو کر قرآن لکھنا شروع کیا۔ جس وقت کسی کے بارہ میں ان کے باہم اختلاف اور جھگڑا ہو پڑتا تو وہ کہتے یہ آیت رسول اللہ صلعم نے فلاں شخص کو پڑھائی تھی۔ پھر اس کو بلوایا جاتا حالانکہ وہ شخص مدینہ سے تین دن کی مسافت پر ہوتا تھا اور جب وہ آجاتا تو اس سے دریافت کرتے کہ فلاں آیت کی قرأت رسول اللہ صلعم نے تمہیں کس طرح پر سنائی تھی وہ شخص کہتا "یوں" اس وقت اس آیت کو لکھ لیتے اور پہلے سے اس کی جگہ خالی رہنے دیتے تھے۔"

اور ابن ابی داؤد نے محمد بن سیرین کے طریق پر کثیر بن افلح سے روایت کی ہے کہ اس نے کہا "جس وقت عثمانؓ نے مصحفوں کے لکھوانے کا ارادہ کیا تو انہوں نے اس غرض سے بارہ مشہور آدمی قریش اور انصار دونوں قبائل کے جمع کئے پھر قرآن کے صحیفوں کا وہ صندوق منگوایا جو عمرؓ کے گھر میں تھا۔ صندوق مذکور آگیا تو عثمانؓ نے ان لکھنے والوں کی نگرانی اپنے ذمہ لی اور نقل کرنے والوں کا انداز یہ تھا کہ جب وہ کسی بات پر باہم جھگڑ پڑتے تو اسے پیچھے ڈال دیتے (یعنی اس وقت لکھتے ہی نہ تھے) محمد بن سیرین کا قول ہے "وہ لوگ اس کی کتابت میں اس لئے تاخیر کر دیتے تھے کہ کسی ایسے شخص کا انتظار دیکھیں جو ان میں سب کی نسبت کلام اللہ کے آخری دور سے قریب تر زمانہ رکھتا تھا اور پھر اس کے بیان کے مطابق جو کچھ لکھنا رہ گیا ہے اسے لکھیں" ابن ابی داؤد ہی صحیح سند کے ساتھ سوید بن غفلہ سے روایت کرتا ہے کہ اس نے کہا "علیؓ نے فرمایا" عثمانؓ کے بارہ میں بجز کلمۂ خیر کے اور کچھ مت کہو۔ کیونکہ واللہ انہوں نے مصاحف میں جو کچھ بھی تغیر کیا ہے وہ ہماری ایک جماعت کثیر کی عام رائے سے کیا ہے۔ انہوں نے ہم سے کہا "تم لوگ قرآن کی قرأت کے بارہ میں کیا کہتے ہو؟ مجھے خبر ملی ہے کہ بعض اشخاص دوسروں سے کہتے ہیں۔ میری قرأت تمہاری قرأت سے بہتر ہے" اور یہ بات قریب کفر کے ہے" ہم لوگوں نے کہا پھر تمہاری کیا رائے ہے؟ عثمانؓ نے جواب دیا "مجھ کو تو یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے کہ تمام مسلمانوں کو ایک ہی مصحف پر جمع کر دیا جائے تاکہ پھر افتراق اور اختلاف پیدا نہ ہو سکے" اور ہم لوگوں نے کہا "تمہاری رائے بہت اچھی ہے"

ابن التین اور چند دیگر علماء کا قول ہے۔ ابی بکرؓ اور عثمانؓ کے قرآن کو جمع کرنے میں یہ فرق ہے کہ ابی بکرؓ کا جمع کرانا اس خوف سے تھا کہ مبادہ حاملانِ

قرآن کی موت کے ساتھ قرآن کا بھی کوئی حصہ جاتا رہے کیونکہ اس وقت تمام قرآن ایک ہی جگہ اکٹھا نہیں تھا۔ چنانچہ ابوبکرؓ نے قرآن کو صحیفوں میں اس ترتیب سے جمع کیا کہ ہر ایک سورت کی آئیتیں حسب بیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یکے بعد دیگرے درج کر دیں اور عثمانؓ کے قرآن کو جمع کرنے کی یہ شکل ہوئی کہ جس وقت وجوہ قرأت میں بکثرت اختلاف پھیل گیا اور یہاں تک نوبت آگئی کہ لوگوں نے قرآن کو اپنی اپنی زبانوں میں پڑھنا شروع کیا اور یہ ظاہر ہے کہ عرب کی زبانیں بہت وسیع ہیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں میں سے ہر ایک زبان کے لوگ دوسری زبان والوں کو برسر غلط بتانے لگے اور اس بارہ میں سخت مشکلات پیش آنے اور بات بڑھ جانے کا خوف پیدا ہوگیا۔ اس لئے عثمانؓ نے قرآن کے صحف کو ایک ہی مصحف میں سورتوں کی ترتیب کے ساتھ جمع کردیا اور تمام عرب کی زبانوں کو چھوڑ کر محض قبیلہ قریش کی زبان پر اکتفا کر لی۔ اس بات کیلئے عثمانؓ دلیل یہ لائے کہ قرآن کا نزول دراصل قریش ہی کی زبان میں ہوا ہے۔ اگرچہ ابتداء میں وقت اور مشقت دور کرنے کے لئے اس کی قرأت غیر زبانوں میں بھی کر لینے کی گنجائش دے دی گئی تھی۔ لیکن اب عثمانؓ کی رائے میں وہ ضرورت مٹ چکی تھی۔ لہٰذا انہوں نے قرآن کی قرأت کا انحصار محض ایک ہی زبان میں کردیا" قاضی ابوبکر اپنی کتاب الانتصار میں کہتے ہیں "عثمانؓ نے ابی بکرؓ نے قرآن کو "مابین اللوحین" ہی جمع کردینے کا قصد نہیں کیا بلکہ انہوں نے تمام مسلمانوں کو ان معروف اور ثابت قرأتوں پر جمع کر دینے کا ارادہ کیا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول چلی آرہی تھیں اور جس قدر قرأتیں ان کے سوا پیدا ہوگئی تھیں ان کو مٹا دینا چاہا تھا نیز انہوں نے مسلمانوں کو ایک ایسا مصحف دیا جس میں کوئی تقدیم۔ تاخیر اور تاویل نہیں۔ وہ تنزیل کے ساتھ ثبت کیا گیا ہے۔ اس کی تلاوت منسوخ نہیں ہوئی ہے۔ وہ اپنے رسم کی مثبت دلیل کے ساتھ لکھا گیا ہے اور اس کی قرأت اور حفظ کے مفروض کا

لحاظ کیا گیا ہے تاکہ بعد میں آنے والی نسلیں فساد اور شبہ میں نہ پڑ جائیں اور یہ خوف بالکل مٹ جائے۔"

(ماخوذ از الاتقان فی علوم القرآن جلد اول صہ ۱۵۸-۱۶۱ از علامہ جلال الدین سیوطی)

امام بخاری کی حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ تمنا عمادی لکھتے ہیں

" آپ کو حیرت ہوگی کہ حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ بھی قریشی ہیں اور مکہ کے رہنے والے ہیں اور ہشام ابن حکیم بھی قریشی اور مکی ہیں۔ دونوں کی زبان ایک ہے دونوں کا لب و لہجہ ایک ہے۔ ایک خاندان اور ایک ہی مقام کے دونوں آدمی سورہ فرقان کو اس قدر اختلاف کے ساتھ پڑھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ ان پر حملہ کرنے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں۔ بمشکل نماز ختم ہونے تک صبر کرتے ہیں اور نماز کے بعد انہی کی چادر میں کس کر گھسیٹتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں سے وہ سورت سنتے ہیں ہشام بن حکیم سے بھی کہتے ہیں کہ ہاں یوں ہی تو نازل ہوئی ہے اور پھر حضرت عمرؓ سے سن کر بھی فرما دیتے ہیں کہ ہاں یوں بھی نازل ہوئی ہے اور پھر ساتھ ہی یہ بھی کہ قرآن تو سات حرفوں پر نازل ہوا ہے۔ جس طرح آسان ہوا کرے پڑھ لیا کرو۔ ان روایات کی بنا پر علامہ سیوطیؒ تفسیر اتقان میں یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ

بہت سے عوام جو یہ نقل کرتے ہیں کہ اس سے مراد سات قرائتیں ہیں۔ یہ بہت ہی بڑی جہالت ہے۔ اس پر اتقان کا محشی لکھتا ہے۔

کیونکہ سات قرائتیں سب کی سب ایک ہی حرف میں ہو سکتی ہیں اور وہ لغت قریش ہی تو ہے۔

بخاری کی اس حدیث پر علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ شرح بخاری میں لکھتے ہیں :-

اس حدیث سے ان لوگوں کے قول کی تقویت ہوتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حروف

سے مراد مترادف الفاظ کے ساتھ معنوں کا ادا کر دینا ہے خواہ وہ ایک ہی لغت سے کیوں نہ ہو۔ کیونکہ یہاں ہشام کی لغت قریش ہی کی زبان تو ہے اور ایسے ہی عمرؓ کی لغت بھی اور اس کے باوجود دونوں کے پڑھنے میں اختلاف ہو رہا ہے۔ ابن عبدالبرؒ نے ایسا ہی کہا ہے اور اکثر اہلِ علم سے یہی منقول ہے کہ سات حرفوں سے یہی منقول ہے۔

عمدۃ القاری جلد ۲۰/ص۲۷

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ یہ اختلافات صرف لب ولہجہ اور قرائتوں کے اختلاف نہیں تھے بلکہ مترادف الفاظ کے ساتھ مطلب اور معنی ادا کر دینے کے اختلافات تھے۔ ہر شخص کو یہ آزادی حاصل تھی کہ وہ قرآن کے معنی اور مضمون کو اپنے الفاظ میں جس طرح چاہے بیان کر دے۔

• روایات پر ایک بہت بڑا اعتراض یہ بھی تھا کہ جو کچھ روایتوں میں بیان کیا جا رہا ہے۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ نہیں ہیں۔ روایت بالمعنی ہے۔ یعنی راوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالب کو اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ اس لئے معلوم نہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا تھا اور سننے والے نے اپنے الفاظ میں اس کو کس طرح نقل کر دیا ہے۔ اس اعتراض سے بچنے کے لئے عجم کی سازش نے قرآن کریم کو بھی بالکل اسی طرح بدلا کر رکھ دیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہر شخص کو یہ آزادی حاصل تھی کہ وہ قرآن کے معنی اور مضمون کو اپنے الفاظ میں جن مترادف الفاظ کے ساتھ چاہے بیان کر دے۔ مختصراً یہ کہ ان روایات کی رُو سے موجودہ قرآن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتب نہیں کیا تھا نہ اس کو لکھوایا تھا۔ صحابہؓ کے زمانے میں حضرت ابوبکرؓ نے عثمانؓ نے یا زید ابنِ ثابتؓ نے اسے لکھا اور مرتب کیا جس میں غلطیاں بھی رہ گئیں۔ حجاج ابنِ یوسف نے اپنے زمانے میں گیارہ مقامات پر اصلاح کی۔

نتیجہ ظاہر ہے کہ جو قرآن آج ہمارے پاس موجود ہے وہ قرآن کے معنی اور مضمون کی وہ تعبیر ہے جو حضرت عثمانؓ نے اپنے الفاظ (یا دیگر صحابہؓ کے الفاظ میں) میں دی تھی اور حجاج ابن یوسف نے اس کی اصلاح کی تھی۔

کتاب المصاحف ایک سو بچانوے صفحات پر پھیلی ہوئی ایک ضخیم کتاب ہے پوری کتاب کو نقل کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ جن حضرات کو شوق ہو وہ روایات کے اس مہتمم بالشان خزانے کو خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ لیکن ہم اپنے ان ناظرین سے جن کے دل میں ایمان اور احترام قرآن کی ایک ننھی سی چنگاری بھی روشن ہو۔ مندرجہ بالا اقتباسات کو پیش کرنے کے بعد صرف اتنا سوال کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ذرا اپنے دلوں کا جائزہ لے کر اتنا بتائیں کہ ان اقتباسات کو پڑھنے کے بعد قرآن کریم کے متعلق ان کے دلوں میں کیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ کیا ایسی کتاب جس کے متعلق آپ نے یہ کچھ پڑھا ہے اللہ کی کتاب کہلانے کی مستحق ہو سکتی ہے اور کیا اس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ اللہ کی طرف سے ہے اور وہ آج تک محفوظ ہے اور یہ وہی کتاب ہے جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئی اور جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امتِ محمدیہ کو دیا تھا۔

سوچیے، ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیے اور بتائیے کہ آخر اس کتاب اور تورات و انجیل میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے۔

تورات، انجیل اور دیگر مذاہب کی بقیہ آسمانی کتابوں کے خلاف آپ سب سے بڑا اعتراض یہی وارد کرتے ہیں (اور اسی کی بنا پر آپ انہیں غیر یقینی قرار دیتے ہیں) کہ ان کے متعلق یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ حرفاً حرفاً وہی ہیں جو ان مذاہب کے پیغمبروں نے اپنی امت کو دی تھیں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ ان روایات نے کس طرح قرآن کو بھی اسی سطح پر لا کھڑا کر دیا ہے۔ جہاں دیگر مذاہب کی کتابیں تھیں؟ دیکھ لیجیے

کہ عجم کی یہ سازش کس طرح کامیاب ہوئی؟ چنانچہ آج غیر مسلم مستشرقین انہی روایات کو سامنے لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی روشنی میں بتایئے کہ تم قرآن کی حفاظت کا دعوے کس طرح ثابت کر سکتے ہو؟ آپ کو معلوم ہے کہ یہی کتاب المصاحف "جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے شائع کس طرح سے ہوئی ہے؟ ایک فاضل مستشرق ہے (ARTHAR JE EFERY) اس نے کیا یہ ہے کہ قرآن کے متعلق جس قدر اختلافات ہماری کتب روایات میں پائے جاتے ہیں ان سب کو ایک جگہ جمع کر کے شائع کر دیا ہے۔ کتاب کا نام ہے (MATERIALS FOR THE HISTORY OF THE TEXT OF THE QURAN)

اس کے ساتھ ہی اس نے اس خیال سے کہ مبادا یہ نہ کہہ دیا جائے کہ ایک غیر مسلم (عیسائی) نے معاندانہ طور پر "غیر مستند چیزوں" کو جمع کر دیا ہے۔ امام ابن ابی داؤد کی "کتاب المصاحف" کو من و عن شائع کر دیا ہے جس میں وہ تمام احادیث موجود ہیں جو ان اختلافات کی سند ہیں اور اسی طرح ساری دنیا پر ظاہر کر دیا کہ یہ ہے اس کتاب کی حقیقت، جس کے متعلق مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ نے لے رکھی ہے۔

علامہ تمنا عمادی از جمع القرآن صہ ۳۷۵-۳۷۱

اب ذرا مندرجہ بالا تبصرہ کی تائید میں ایک حدیث بمعہ حاشیہ ملاحظہ فرمایئے اور سر پکڑ کر بیٹھ جایئے۔

ام المومنین عائشہ سے روایت ہے رجم کی آیت اتری اور بڑے آدمی کو دس بار دودھ پلا دینے کی اور یہ دونوں آیتیں ایک کاغذ پر لکھی تھیں۔ میرے تخت کے تلے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اور ہم آپ کی وفات میں مشغول تھے تو گھر کی پلی ہوئی بکری آئی اور وہ کاغذ کھا گئی۔"

(سنن ابن ماجہ جلد دوم صہ ۸۰۹ شائع کردہ الحدیث اکادمی کشمیری بازار لاہور)

مندرجہ بالا حدیث سے دو باتیں تو واضح ہیں۔ اوّل یہ کہ قرآن کریم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کتابی شکل میں موجود نہ تھا۔ اور دوئم یہ کہ بعد میں کتابی شکل میں مرتب کرتے وقت یہ دونوں آئیتیں قرآن کریم میں درج ہونے سے رہ گئیں۔ اس طرح آج جو قرآن کریم ہمارے پاس موجود ہے وہ معاذاللہ نامکمل ہے

اب اس حدیث کے نیچے جو حاشیہ لکھا ہے وہ بھی ذرا ملاحظہ فرمایئے لکھا ہے:-

اس حدیث سے یہ نکلا کہ یہ حکم بھی قرآن مجید میں اترا تھا کیونکہ حضرت عائشہ کی شہادت اس باب میں کافی ہے اور وہ بڑی عالم تھیں۔ دین کے عالموں میں سے اور صاحب حفظ اور صاحب عقل تھیں اور فقیہہ تھیں۔ راضی ہوا اللہ تعالیٰ ان سے۔ اب سالم کی حدیث میں یہ شبہ ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے آدمی کے لئے یہ کیسے جائز رکھا کہ وہ اجنبی عورت کے پستان میں منہ لگادے اور ہم کہتے ہیں کہ حدیث میں اس کی تصریح کہاں ہے اور جائز ہے کہ ابوحذیفہ کی بی بی نے دودھ نچوڑ کر ان کو پلا دیا ہو اگر چھاتی سے بھی پلایا ہو تو کچھ قباحت نہیں۔ جب سالم ان کے بچپن سے پلے ہوئے اور مثل بیٹے کے تھے اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ایسا کیا اور اہل ایمان کا یہ کام نہیں کہ احادیث میں ایسے واہی احتمالات نکالیں اور ان کو رَد کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر حدیث ہمارے سر اور آنکھوں پر ہے گو ہماری رسم و رواج بلکہ ہمارے باپ دادا، تمام خاندان تمام ملک کے خلاف ہو سب کو چھپر پر رکھو۔

(حاشیہ (ابنِ ماجہ جلد دوم صہ ۸۰۹ شائع کردہ اہلحدیث اکادمی کشمیری بازار کراچی)

قرآن میں غلطیاں رہ گئیں (معاذاللہ)

اس کے متعلق علامہ تمنا عمادی لکھتے ہیں:

"یہاں تک کہا گیا ہے کہ قرآن حضرت عثمانؓ کے عہد میں مرتب ہوا لیکن یہ قرآن کس قسم کا تھا اس کی بابت بھی سن لیجیے"!

"امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ عبدالاعلیٰ بن عبداللہ بن عامر قرشی سے نقل کرتے ہیں کہ جب حضرت عثمان رضؓ مصحف سے فارغ ہو گئے اور انہوں نے اسے دیکھا تو فرمایا "تم لوگوں نے بہت اچھا کیا اور خوب کیا مگر اس میں کچھ غلطیاں مجھے نظر آئی ہیں جنہیں عرب لوگ اپنی زبانوں میں ٹھیک کرلیں گے۔

لیجئے قرآن عہدِ عثمانی میں مرتب تو ہوا لیکن اس میں بھی غلطیاں رہ گئیں۔ ان غلطیوں کو حضرت عثمانؓ نے درست نہیں کیا بلکہ علیٰ حالہٖ رہنے دیا کہ عرب خود اپنی زبان سے درست کرلیں گے۔

"امام ابنِ ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ عکرمہ طائی سے نقل کرتے ہیں کہ جب حضرت عثمان کے پاس مصحف لایا گیا تو اس میں انہیں کچھ غلطیاں نظر آئیں۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ اگر لکھنے والا بنو ہذیل کا اور لکھنے والا بنو ثقیف کا کوئی آدمی ہوتا تو اس میں یہ غلطیاں نہ پائی جاتیں۔

سعید ابنِ جبیر سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ قرآن میں چار حرف غلط ہیں۔ ۱۔ الصابئون ۵/۶۹ ۲۔ والمقیمین ۴/۱۶۲ ۳۔ فاصدق واکن من الصالحین ۶۳/۱۰ ۴۔ ان ہذان لساحران ۲۰/۶۳۔

زبیر ابو خالد کہتے ہیں کہ میں نے ابان بن عثمان سے پوچھا کہ آیت

الراسخون فی العلم منہم والمومنون یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک والمقیمین الصلوٰۃ والیولتون الزکوٰۃ (الآیۃ) کیسے ہوگیا۔ آگے اور پیچھے رفع لایا گیا ہے اور المقیمین پر نصب ہے۔ ابانؒ نے جواب دیا کہ یہ کاتب کی غلطی ہے۔ پچھلا حصہ لکھ چکا تھا۔ اس نے پوچھا آگے کیا لکھوں لکھوانے والے نے کہا المقیمین الصلوٰۃ لکھو۔ اس سے جو کچھ کہا گیا لکھ دیا۔

عروہ کہتے ہیں کہ قرآن کی غلطیوں کے متعلق میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا ان ھذان لساحران والمقیمین الصلوٰۃ والموتون الزکوٰۃ اور والذین ھادوا والصابئون کے متعلق سوال تھا۔ حضرت عائشہ نے کہا بھتیجے یہ کاتبوں کا کام ہے کہ انہوں نے لکھنے میں غلطی کر ڈالی۔

ماخوذ از جمع القرآن از تمنا عمادی صہ ۳۴۹-۳۴۸

بخاری شریف کی روائت میں یہ جو آیا ہے کہ خلیفہ دومؓ کے بعد قرآنی مصحف حضرت حفصہؓ کے پاس سے ملے تو اس کے متعلق مفتی عبداللطیف رحمانی صاحب تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

" خلیفہ اول نے یہ قرآن اگر لکھایا ہوگا تو بیت المال کے روپے سے لکھایا ہوگا۔ کیونکہ خلافت سے چھ مہینے بعد خلیفہ کے مصارف کا متکفل بیت المال کیا گیا تھا اور بیت المال سے وہ اپنے ضروری مصارف خورو نوش کے مطابق لیتے تھے جیسا کہ خلیفہ اول کے حالات میں مؤرخین لکھتے ہیں اور نیز اس واقعہ سے بھی اس کا پورا ثبوت ملتا ہے کہ آپ کی بی بی نے ایک روز جب شیرینی کی فرمائش کی تو جواب دیا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ بی بی نے کہا اجازت ہو تو روزمرہ کے صرف سے کچھ پیسے بچا کر جمع کر لوں۔ فرمایا بہتر۔ کچھ روز میں چند پیسے جمع کر کے دیئے اور کہا مٹھائی لا دو۔ خلیفہ نے پیسے لے کر فرمایا کہ یہ خرچ ضروری سے زیادہ ہیں۔ لہٰذا بیت المال کے ہیں اور

بیت المال میں جمع کرکے اپنے وظیفہ سے اسی قدر کم کر دیا۔

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ خلیفہ کے پاس اپنا ذاتی سامان کیا تھا۔ اور بیت المال میں انہیں کس قدر احتیاط تھی۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس قرآن کے مصارف بیت المال سے ادا کئے گئے ہوں گے اور یہ قرآن چونکہ بیت المال کا حق تھا اسی لئے یہ ان کی وفات کے بعد خلیفۂ اوّل کے ورثار کو نہیں دیا گیا۔ بیت المال میں رہا اور خلیفۂ دوم کے پاس پہنچا۔ اگر خلیفۂ اوّل کا اپنا ہوتا تو ضرور ان کے ورثار کو ملتا لیکن یہاں دو باتیں اس واقعہ کو غلط ٹھہراتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ خلیفۂ اوّل نے بیت المال کی جو اشیار چھوڑیں اور وہ خلیفۂ دوم کو سپرد کی گئیں۔ ان کی فہرست میں اس قرآن کا نام نہیں ہے اور خلیفۂ اوّل نے جن چیزوں کو سپرد کرنے کو فرمایا تھا۔ اس میں اس کا نام نہیں لیا۔ تاریخ الخلفار میں ہے۔

ترجمہ " حضرت ابوبکر نے نزاع کے وقت فرمایا کہ اے بیٹی میں خلیفہ بنایا گیا۔ میں نے بیت المال سے روپیہ نہیں لیا مگر بقدر موٹا کھانے اور موٹا پہننے کے اور اب میرے پاس بیت المال کا سوا اس غلام حبشی اور پانی لانے کی اونٹنی اور اس پرانی چادر کے کچھ نہیں میرے بعد اس کو عمرؓ کے پاس بھیج دینا۔

اگر واقعی کوئی قرآن بیت المال کے صرف سے اس اہتمام سے لکھا گیا تھا تو بیت المال کی فہرست میں اس کا نام ضروری تھا اور خلیفۂ اوّل اس کے سپرد کرنے کو اہتمام سے فرماتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ خلیفۂ دوم کے بعد یہ قرآن خلیفۂ سوئم کی تحویل میں ہونا چاہیئے تھا نہ کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس۔ کیونکہ یہ خلیفہ کی ذاتی مِلک نہ تھی۔ اب بعید نہیں بلکہ یہ امر نہایت قریب تر ہے کہ احتمالات اور امکانات کے ورطہ میں غوطہ لگانے والے طبعیت آفرینی کی یوں داد دیں کہ یہ قرآن خلیفۂ اوّل کا ذاتی تھا۔ اپنے خاص روپے سے لکھایا تھا اور خلیفۂ دوم کو آخر وقت

میں انہوں نے ہبہ کر دیا تھا اور بیت المال کا نہ تھا تاکہ خلیفۂ دوم کی وفات کے بعد خلیفۂ سوئم کی نگرانی میں پہنچتا۔ ان کی اس جدت اور نکتہ آفرینی کی میں بھی دل سے قدر کرنے کو اور داد دینے کو تیار ہوں۔ مگر وہ ہبۂ نامہ جس کی مدد سے یہ ہبہ ثابت کیا جائے اگر کسی سند میں دکھائیں اور خلیفۂ اول کی آمدنی میں اس قدر قوت اور زور دکھائیں جو اس بار کی متحمل ہو سکے تو البتہ قابل تسلیم ہے۔ اور بلا اس کے یہ خیال آفرینی واقعیت کی سطح پر رونما نہیں ہو سکتی۔ بلکہ تاریخ سے تو یہ ثابت ہے کہ نہ خلیفۂ اول کے پاس اپنا ذاتی اس قدر مال تھا جس سے قرآن لکھاتے۔ بیت المال سے اپنے مصارف کیلئے جو کچھ وہ لیتے تھے اس میں نہ اس کی گنجائش تھی۔ الغرض اس قرآن کے لکھانے کی دو ہی صورت ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس صحیفہ وغیرہ کی قیمت خلیفۂ اول اپنے پاس سے صرف کریں۔ دوسرے یہ کہ بیت المال سے دیں اور واقعات ان دونوں صورتوں کے مخالف ہیں۔

اس روایت میں یہ کہنا کہ سورہ براۃ کا آخر ابوخزیمہ انصاری کے سوا کسی دوسرے کے پاس نہ تھا۔ ایک ایسی پہیلی اور چیستان ہے جس کی گرہ کشائی ناممکن ہے۔ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ سورہ براۃ پوری ایک وقت میں کامل آخر زمانہ میں نازل ہوئی۔ جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجمع میں پڑھا۔ حضرت علیؓ نے نویں سال حج میں تین مقامات میں یعنی عرفہ منیٰ یا مکہ میں لوگوں کو تمام وکمال سنایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے یاد کرنے کا خاص حکم دیا۔ زید کو تمام قرآن یاد تھا اور لکھا ہوا تھا۔

ابی بن کعب کے پاس بھی تمام قرآن لکھا ہوا اور یاد تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کو سورۂ براۃ یاد تھی۔ چنانچہ انہوں نے مکہ میں جا کر سنائی اور زید کے قرآن لکھنے کے وقت یہ لوگ مدینہ میں موجود تھے۔ پھر اب زید کا یہ کہنا کہ ابوخزیمہ کے سوا کسی کے پاس یہ آیت نہ تھی وہ بات ہے جس کے ماننے کے لئے کسی طرح کوئی مسلمان تیار

نہیں ہوسکتا۔

الحاصل زہری کی اس روایت میں چھ امر تو ایسے ہیں جو واقعات کی رُو سے سچائی کے معیار میں صحیح نہیں اترتے اور وہ بالکل غلط ہیں۔

۱ جنگِ یمامہ میں بہت سے قرآن کے قاری شہید ہوئے۔

۲ زید نے آنحضرتؐ کی حیات میں قرآن جمع نہیں کیا تھا۔

۳ زید پورے قرآن کے حافظ نہ تھے۔

۴ آنحضرتؐ نے پورا قرآن جمع نہیں کرایا تھا۔

۵ حضرت عثمان نے آنحضرتؐ کے عہد میں قرآن جمع نہیں کیا تھا۔

۶ ابو خزیمہ انصاری کے سوا کسی کے پاس سورہ برأۃ کا آخر لکھا ہوا نہ تھا اور سات باتیں ایسی ہیں جو شب و روز کے تجربہ اور صحابہ اور مسلمانوں کے حالات کے اعتبار سے بعید نہیں اور یہ دونوں ان کی اجازت نہیں دیتے۔

۱ ڈیڑھ سال میں زید کا تمام و کمال قرآن کو تلاش کر کے لکھ دینا۔

۲ حضرت عمرؓ کا یہ خیال کرنا کہ قرآن ضائع ہو جائے گا۔

۳ قرآن جمع کرنے کے پہلے قاریانِ قرآن کو لڑائی میں بھیجنا۔

۴ قرآن کے جمع کرنے کو محض زید کے متعلق کرنا۔ باوجودیکہ خود مدینہ میں ان سے بہتر قاری بھی موجود تھے۔

۵ اس قرآن جمع شدہ کا حضرت حفصہ کے پاس رہنا نہ خلیفہ سوم کے۔

۶ خلیفہ اول اور دوم کا اپنے عہد میں اس قرآن کی نقلیں مُلک میں شائع نہ کرنا۔

۷ مسلمانوں میں سے ایک مسلمان کا بھی اس قرآن کی نقل نہ لینا۔

اس کے علاوہ زہری کی روایت کا اختلاف اور نیز زہری کی یہ تنہا روایت

بہت سی ان روایات کے مخالف ہے جو اپنی کثرت کی وجہ سے تواتر کے مرتبہ کو پہنچ گئے ہیں۔

"یہ عجیب بات ہے کہ جو واقعہ نہایت ہی بے اصل اور سراسر غلط اور جس قدر بے بنیاد ہوتا ہے اسی قدر مشہور اور زبان زدِ عوام و خواص ہو جاتا ہے۔ خلیفۂ اول کے جمع قرآن کے واقعہ نے شہرت کا یہ درجہ پایا ہے کہ آج محدثین اور مؤرخین اور ہر مسلمان کی زبان اور قلم پر ہے اور انتہا یہ ہے کہ بخاری جیسے ناقد اور محقق کی تحقیق کی روشنی بھی اس شہرت کے آگے ماند پڑ گئی۔ مگر پھر بھی حق حق ہے اور باطل باطل۔ جھوٹ اور فریب گو مشہور ہو جائے۔ قبول کر لیا جائے لیکن انجام کار سچائی کی روشنی غالب آکر اسے محو کر دیتی ہے اور وہ ظاہر ہو کر رہتا ہے"

ماخوذ از تاریخ القرآن صہ ۱۳۲ - صہ ۱۳۰

اس کے علاوہ مفتی عبد اللطیف رحمانی صاحب لکھتے ہیں:

"زید نے خلیفۂ اول کے عہد میں ان صحائف میں تمام قرآن نقل کیا تھا مگر تعجب ہے بارہ تیرہ سال تک یہ ویسے ہی جزدان میں رکھا رہا کسی نے نہ دیکھا اور دیکھا بھی تو کسی کو اس کا پتہ نہ چلا کہ سورۃ احزاب سے ایک آیت اس میں لکھنے سے رہ گئی جس کا پتہ اس وقت خلیفۂ سوم کے عہد میں نقل کراتے وقت ہوا اور تعجب ہے کہ آنحضرت کے عہد مبارک سے خلیفۂ سوئم کے عہد تک سورۂ احزاب کی اس آیت کو کسی نے نہیں لکھا سوائے خزیمہ کے اور کسی کے پاس نہ نکلی۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو یہی ایک بات اس روایت کی صداقت اور عدم صداقت کی عمدہ دلیل ہے۔ علاوہ اس کے زید نے خلیفہ اول کے عہد میں جب نہایت کوشش اور سعی سے قرآن جمع کیا اور زید کو قرآن یاد بھی تھا تو اس وقت سورۃ احزاب کی آیت کا لکھنے سے رہ جانا ایک ایسی بات ہے جو انسانی پہنچ سے بالاتر ہے اور جب زید کے لکھنے اور حفظ

کی یہی حالت ہے تو ممکن ہے کہ اس میں اور بھی کئی آیات چھوٹ گئی ہوں۔ اگر زید تیسری بار نقل کرتے تو ممکن تھا کہ وہ پھر زید کو یاد آجاتیں۔ مسلمانوں کے یہاں ایسی روایات کی جو وقعت ہے وہ اسے خوب جانتے ہیں جن کو ایسی روایات میں دخل ہے۔ کیا محض زید کے لکھنے اور ان کی یاد کے بھروسے اور وثوق پر قرآن مان لیا گیا ہے اور کیا محض زید کے کہنے اور لکھنے سے قرآن میں کسی آیت کا اضافہ ممکن تھا۔ ایں خیال است و محال است و جنوں۔ ہزاروں قرآن کے نسخے بلکہ لاکھوں اس وقت مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہوں گے اور اس سے بھی بہت زیادہ حفاظ قرآن موجود تھے اور مسلمانوں کے چھوٹے بڑے مرد، عورت، ادنیٰ، اعلیٰ کی زبان پر قرآن کا حرف برق کی طرح رواں تھا۔ مسجدیں اور نمازیں اس کی صدا سے گونج رہی تھیں۔ اس پچیس سال میں بلکہ سینتیس سال میں جس قدر قرآن کی اشاعت ہو گئی تھی وہ زید اور خلیفہ سوم کی سعی سے بے نیاز تھی اور اتنے مسلمانوں کے دلوں سے کسی حرف یا قرأت کا دھو دینا کسی انسان کا کام نہیں تھا۔

ہم مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ قرآن کے الفاظ، خدا کے الفاظ ہیں اور وحیٔ الٰہی کے جو الفاظ تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعینہٖ انہیں الفاظ کو پہنچایا۔ ان آسمانی الفاظ کے بجائے دوسرے لفظوں کو رکھنا خواہ وہ آسمانی لفظوں کے ہم معنی ہی کیوں نہ ہوں، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ممکن ہے اور نہ کوئی مسلمان ایسا کر سکتا ہے۔ آنحضرتؐ کی نبوت سے ۲۵ھ تک یعنی اڑتیس سال کی مدت میں تمام اسلامی شہروں میں اس کی اشاعت کمال عروج تک پہنچ گئی تھی اور مسلمانوں کے سینوں اور سفینوں و دلوں میں قرآن کا ہر لفظ آفتاب و ماہتاب کی طرح چمک رہا تھا۔ رمضان میں اسلامی دنیا کی ہر مسجد میں کم سے کم ایک بار ضرور پڑھا جاتا تھا۔ پنجگانہ نمازمیں۔ آخر رات میں روزانہ تلاوت میں اس کا معمول تھا۔ اس وقت قرآن کی یہ حالت نہ تھی کہ اس

سے مسلمان ناواقف ہوں۔ یا جو قرآن مسلمانوں کے دلوں زبانوں، صحیفوں تعلیم گاہوں میں داخل ہوگیا تھا۔ اس پر شک و شبہ کا پردہ کوئی ڈال سکے۔

اب ایسی حالت میں خلیفۂ سوم کا ان لوگوں کو جو قرآن لکھنے پر مقرر کئے گئے تھے۔ یہ ہدایت کرنا (اگر کسی لفظ میں تمہیں اختلاف ہو تو ایسی صورت میں وہ لفظ لکھنا جو قریش کے یہاں مستعمل ہو کیونکہ قرآن قریش ہی کی لغت میں نازل ہوا جیسا کہ اس روایت میں ہے۔

"یعنی خلیفۂ سوم نے ان لوگوں میں سے جو قرآن لکھنے پر مقرر کئے گئے تھے۔ قریشیوں کو کہا کہ تم سے اور زید سے اگر کوئی لفظ میں اختلاف ہو تو اپنی زبان کا لفظ لکھنا کیونکہ تمہاری ہی زبان میں قرآن اترا ہے) اس روایت کے اعتبار کو مسلمانوں سے کیا مخالفینِ اسلام کی نظروں سے بھی کھو دیتا ہے اور جو شخص مسلمانوں کی حالت اور قرآن کی تاریخ سے واقف ہے وہ ہرگز کسی حالت میں اس کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قرآن اس ہی روایت کے موافق جب قریش کی لغات میں نازل ہوا ہے۔ قریش کی زبان کے سوا کسی دوسری زبان کا لفظ اس میں نہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن جن الفاظ میں نازل ہوا ان ہی الفاظ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنچایا اور مسلمانوں نے وہی الفاظ یاد کئے' لکھے۔ پھر کیا یہ ممکن ہے کہ زید جو انصار سے ہیں نہ قریش سے، ان کے قرآن میں کوئی ایسا لفظ ہو جو قریشی نہیں یعنی وہ درحقیقت قرآن کا لفظ نہیں یا ان کو قرآن کے الفاظ کے بجائے دوسرے لفظ یاد ہوں۔ حالانکہ زید وہ شخص ہیں جو پچیس سال تک برابر قرآن پڑھاتے رہے ہیں۔ قرآن کا درس دے کر کئی ہزاروں کو قرآن کا حافظ بنایا۔ عہدِ مبارک میں وحی یعنی قرآن لکھتے تھے۔ آخر سال میں حضرت جبریل سے جو آنحضرت نے دوبار قرآن کا دَور کیا تھا تو اس میں یہ زید برابر کے شریک تھے۔ تمام قرآن آنحضرت کے عہد میں یاد کیا اور لکھا تھا۔ خلیفہ اول و دوم نے ان کے مقابلے میں کسی کو ترجیح نہ دی

انہیں پر اپنا زیادہ اعتماد ظاہر کیا۔ اسی لیئے انہی کو قرآن لکھنے پر مقرر کیا۔ اور اس وقت کسی قریشی کو اس کام میں ان کا شریک نہ کیا اور نہ یہ ہدایت کی کہ قریش کی زبان میں لکھنا۔ اب ایسی صورت میں خلیفہ سوئم کا زید کے ساتھ ان کو یعنی سعید عبدالرحمٰن، عبداللہ، جو قریش ہیں شریک کرنا اور یہ فرمانا کہ تم تینوں سے اور زید سے اگر کسی لفظ میں اختلاف ہو تو وہاں زید کا اعتبار نہ کرنا بلکہ اپنی زبان کے موافق لکھنا۔ حالانکہ یہ تینوں شخص نہ مشہور قرأ ہیں اور نہ زید کی مثل ماہر ہیں اور نہ اس قابل ہیں کہ زید کے مقابلہ میں ان کا پلہ بھاری ہو۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت سعید اور عبداللہ نو سال کے تھے عبدالرحمٰن دس برس کے اور آنحضرت سے انہوں نے کچھ نہیں پڑھا تھا اور زید نے تمام قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا تھا۔ پھر ایسی صورت میں زید سے یہ تینوں اگر قرآن کے کسی لفظ میں اختلاف کریں تو بمقابلہ زید کے پھر بھی ان کا اعتبار ہونا مسلمان اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اور کیا یہ ممکن تھا کہ زید نے جن الفاظ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تعلیم فرمایا۔ ان الفاظ کو چھوڑ کے خلیفہ کی ہدایت کے موافق ان تینوں کے بتائے ہوئے لفظوں کو لکھتے۔ ہرگز نہیں اور کیا کوئی مسلمان اس کا یقین کر سکتا ہے کہ خلیفہ نے زید کو اس قسم کی ہدایت کی ہوگی کہ تم نے جن الفاظ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن الفاظ کو تمہیں دیا۔ جن الفاظ کو تم اب تک پڑھتے رہے اور ایک بڑی جماعت کو تم نے تعلیم کیا۔ ان الفاظ کو تم محض اس لئے چھوڑ دینا کہ وہ قریش کی لغت کا نہیں۔ اور قرآن قریش کی لغت میں نازل ہوا ہے۔ میں کہتا ہوں زید نے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن میں عربی کے سوا دوسری زبان کا لفظ بھی سنا یا پڑھا ہوتا تو پھر تمام عالم کے کہنے سے بھی وہ اس لفظ کو کسی طرح چھوڑ نہیں سکتے تھے خواہ ان کو یوں سمجھایا ہی جاتا کہ قرآن عرب کی زبان

میں نازل ہوا ہے اور یہ لفظ عربی نہیں کیونکہ کسی لفظ کا قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سن لینا یا آپ سے تعلیم پانا ایک ایسی مضبوط اور مستحکم دلیل ہے کہ قرآن کی تمام عمارت اسی پر قائم ہے، نہ کسی قیاس اور گمان پر۔ اور کیا ایسے قیاسات سے کہ قرآن عربی میں نازل ہوا ہے۔ قرآن کا کوئی حرف اپنی جگہ سے متزلزل ہو سکتا ہے اور مسلمانوں کے اس یقین سے جو انوارِ نبوت سے حاصل ہوا ہے، کسی قسم کی تاریکی کا دھبہ پڑ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! اس کے علاوہ تمام قرآن کا قریش کی لغات کے موافق ہونا خود صحیح نہیں بلکہ قریش کے سوا دوسرے الفاظ بھی قرآن میں ہیں۔ پھر جب یہ بات خود ثابت نہیں اور خلاف ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ حضرت عثمان قرآن کے متعلق ایک غلط بات فرمائیں اور زید بن ثابت سے تسلیم کر لیں اور اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایسا فرمایا تھا اور واقعی یہ امر صحیح بھی تھا کہ قرآن قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے تو پھر یہ ضروری تھا کہ یہ موجودہ قرآن جو اس وقت تمام مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے اور حضرت عثمانؓ کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں کوئی لفظ غیر قریش کا نہ ہوتا۔ حالانکہ اس میں قریش کے سوا بھی دیگر اہلِ عرب کے لغات ہیں۔ اب موجودہ قرآن کو اس روایت کے اس معیار پر جانچو اور دیکھو کہ یہ وہی قرآن ہے جس کو حضرت عثمانؓ نے فرمائش لکھوایا تھا۔ یا ویسا نہیں اور اسی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ روایت کس درجہ قابلِ تسلیم ہے۔

• قرآن اگر قریش کی زبان سے، مخصوص ہے تو ایسی بات نہیں جس کو صرف حضرت عثمانؓ ہی جانتے ہوں بلکہ یہ وہ امر ہے جسے اس وقت کا ہر قرآن دان جو عرب کا باشندہ تھا جانتا ہوگا، خصوصاً خلیفۂ اوّل اور دومؓ تو ہرگز اس سے ناواقف نہ ہوں گے۔ پھر جو قرآن زید سے خلیفۂ اوّل نے بہ مشورہ خلیفۂ دومؓ لکھایا تھا ضرور وہ قریش ہی کی زبان میں لکھایا ہوگا اور ضرور خلیفۂ اوّل اور دوم کی نظر سے گذرا ہوگا۔

اب یہ ناممکن ہے کہ اس قرآن میں کوئی اس زبان کا لفظ ہو جس میں قرآن نازل نہیں ہوا۔ کیونکہ اوّل تو زید نے خود ہی اس قرآن میں ایسے لفظ نہ لکھے ہوں گے اور اگر غلطی سے لکھے بھی ہوں تو خلیفہ اوّل اور دوم نے ضرور اس کی اصلاح فرما کر اس غلطی سے زید کو متنبہ کیا ہوگا تاکہ پھر یہ غلطی نہ ہو کہ قریش کے لغات کے سوا دیگر اہلِ عرب کی لغات کا کوئی لفظ قرآن شریف میں لکھا جائے اور اس اصطلاح اور تنبیہہ کے بعد ناممکن ہے کہ اس قرآن شریف میں جو خلیفۂ اوّل کے وقت میں لکھا گیا تھا، پھر ایسا لفظ ہوتا جو قریش کی لغات سے نہ ہو اور دیگر اہلِ عرب کے لغات سے ہوتا اور اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ خلیفہ اول دوم کی تاکید اور تنبیہہ کے باوجود زید سے پھر بھی ایسی غلطی ہوئی ہو کہ کوئی لفظ قریش کے لغت کے سوا کا ایسا رہ گیا ہو جس پر زید کی نظر کسی وجہ سے نہ پڑی ہو۔ لیکن خلیفہ سوم کے عہد میں جب قرآن شریف کے نقل کی خدمت زید کو ملی اور سعید اور عبدالرحمٰن۔ عبداللہ بن زبیر کا (جو لبطونِ قریش سے ہیں) اس لئے تقرر ہوا کہ جب کسی لفظ میں اختلاف ہو تو لغتِ قریش کے موافق اسے لکھیں اور پھر جب حسب حکمِ خلیفہ سوم کے ان لوگوں نے لکھا تو اب ایسی حالت میں یہ غیر ممکن تھا کہ قرآن شریف میں کوئی ایسا لفظ رہ گیا ہو جو قریش کے لغات سے نہ ہو۔ مگر واقعہ اس کے خلاف ہے اور قرآن شریف میں اِس وقت بھی ایسے الفاظ ملتے ہیں جو قریش کے لغات کے سوا دیگر اہلِ عرب کی لغات سے ہیں جس سے صاف اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ یہ روایت قابلِ احتجاج نہیں ہے۔

زید کا یہ بیان کہ سورۂ احزاب کی اس آیت کو جسے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے سنا تھا نہیں پایا اور تلاش کے بعد خزیمہ یا ابوخزیمہ کے پاس سے ملی یہ وہ بات ہے جو بالکل خلافِ عقل ہے۔ اس لئے کہ زید کے پاس خود اپنا ذاتی لکھا ہوا قرآن ایسا صحیح موجود تھا جس کو زید نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خود آپ کی

زندگی کے اس آخری رمضان میں سنایا تھا جس میں آپ نے دو مرتبہ قرآن شریف حضرت جبرائیل علیہ السلام سے دَور فرمایا تھا۔ علاوہ اس کے اور دوسرے صحابہ جیسے معاذ بن جبل۔ ابی کعب۔ زید بن ثابت، ابو دردا، محمد بن عبید، عثمان بن عفان، تمیم داری، عبادہ بن صامت، ابو ایوب کے پاس بھی پورا قرآن شریف جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا لکھایا ہوا موجود تھا۔ پھر یہ بات کسی طرح قابلِ تسلیم نہیں ہوسکتی کہ تلاش کے بعد بعض ابوخزیمہ یا خزیمہ کے پاس ملی بلکہ یہ ایک ایسی ناقابلِ قبول بات اس روایت میں ہے جو اس روایت کو معیارِ صحت سے گرا دینے کے لیے کافی ہے۔ بالخصوص جبکہ اس کے خلاف پورے قرآن شریف کے عہدِ نبوی میں لکھے جانے کے متعلق اس کثرت سے روائتیں موجود ہیں جو تواتر کے مرتبہ کو پہونچ گئی ہیں۔

اشتباہ کی تیسری روایت جو بخاری کی ہے اس میں زید کا بیان ہے کہ میں نے کھجور کے پتوں اور پتھر کے ٹکڑوں اور آدمی کے سینے سے قرآن جمع کیا اور لکھا یعنی کسی آیت یا کسی سورت کو محض لکھے ہوئے ٹکڑوں پر اعتماد کر کے خلیفۂ اوّل کے عہد میں قرآن میں نہیں لکھا گیا تھا بلکہ حفاظ صحابہ پر بھی آیت اور سورہ پیش کی گئی تھیں۔ اس کے بعد لکھا گیا تھا۔ تو اب حیرت ہے کہ ایسی حالت میں جب سورۃ احزاب حفاظ پر پیش کی گئی۔ جس طرح اس کے آخر کی آئتیں لکھنے سے رہ گئیں۔ جو خلیفۂ سوم کے عہد میں نقل کے وقت معلوم ہوئیں؟ کیا حفاظ صحابہ کی جماعت میں سب کو ایک قلم یہ آیت ذہول ہوگئی تھی اور کسی کو سورۃ احزاب کی آخری آئتیں یاد نہ تھیں جس کی وجہ سے مصحف صدیقی ناقص رہا اور خود زید کو بھی جو مصحفِ صدیقی کے کاتب تھے اور قرآن کے حافظ تھے وہ بھی اس کو سارے حفاظ صحابہ کے ساتھ بھول گئے تھے۔ ایسے واقعہ پر کوئی آنکھ بند کر کے صحت کی مہر کر دے مگر کوئی ذی ہوش اور صاحبِ بصیرت

ایسے ناقابلِ قبول واقعہ پر ایک منٹ کے لئے اعتماد نہیں کر سکتا ہے۔ بالخصوص یہ کہ عہدِ صدیقی میں حفاظ صحابہ پیش کر کے قرآن جمع کیا جاتا ہے اور خلفائے راشدین رحمہم اللہ موجود ہیں اور چاروں قرآن کے حافظ ہیں پھر بھی مصحفِ صدیقی میں سورہ احزاب کی آخری آئتیں لکھی نہیں جاتی ہیں یہ سورۃ ناقص رہتی ہے۔ حالانکہ خلیفہ اول اور خلیفہ دوم کو قرآن کی حفاظت اور اس کی صحت اور اس کے لفظ لفظ کی درستی کا جس قدر اہتمام تھا اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات ایسی خلافِ درایت معلوم ہوتی ہے جس کو کوئی ذی علم جو حفاظ صحابہ اور خلفائے راشدین کی زندگی سے علم رکھتا ہو ہرگز صحیح نہیں سمجھ سکتا ہے۔

اس روایت میں جس قرآن کو حضرت حفصہ کے پاس سے خلیفہ سوم نے طلب کیا تھا وہی قرآن ہے جس کے متعلق بخاری کی حدیث میں زید کا یہ بیان ہے کہ میرا لکھا ہوا قرآن زندگی بھر خلیفہ اکبر کے پاس رہا۔ ان کے بعد عمر رضی اللہ عنہ کے پاس۔ پھر ان کے بعد ان کی بیٹی حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس رہا مگر اتنے زمانہ تک جن صحابیوں کے پاس یہ قرآن رہا آیا۔ اس طرح رہا جس طرح مسلمان تبرکاً قرآن اپنے گھروں میں رکھتے ہیں۔ میرے نزدیک صحابہ کرام خصوصاً خلفاء راشدین اور ازواجِ مطہرات کے متعلق ایسا خیال ایسی بدظنی ہے جو بعض الظن اثم کے مصداق ہے۔

بہرحال ان بزرگوں کی زندگی پر نظر رکھتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ ضرور اس قرآن سے تلاوت کی جاتی ہوگی۔ کیونکہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم سے کہ یہ یاد سے دیکھ کر تلاوت کو وہی فضیلت ہے جو فرض نماز کو نفل پر۔ صحابہ کرام کی ذات سے بالکل مستبعد ہے کہ اس علم کے بعد ان کی خواہش اور کوشش نہ ہو کہ دیکھ کر تلاوت کریں۔ بالخصوص خلفاء راشدین اور ازواج مطہرات۔ پس باوجود اس کے کہ مصحف صدیق خلیفہ سوم کے عہد تک ہمیشہ ایسے لوگوں کے پاس رہا جو حافظ تھے۔ اور جو بفحوائے حدیث مذکور باوجود حافظ ہونے کے دیکھ کر تلاوت فرماتے ہوں گے۔ مثلاً حضرت ابوبکر۔ پھر اسی طرح

حضرت عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ۔ باوجود حفاظ ہونے کے فضیلت مذکور کی بنا پر ضرور دیکھ کر تلاوت فرماتے ہوں گے اس طرح حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی باوجود حافظ ہونے کے دیکھ کر تلاوت فرماتی ہونگی۔ تو ایسی حالت میں سورہ احزاب کی آیتوں کے متعلق کسی کو خبر نہ ہو اور اس غلطی کا اتنے دنوں تک رہ جانا اور خلیفۂ سوم کے عہد میں زید کو اس کے نقل کے وقت معلوم ہونا ایک ایسی بات ہے جو انسان کی فہم سے بالاتر ہے کہ ایک حافظ نہیں بلکہ تین تین حافظوں نے اس زمانہ تک جس قرآن میں تلاوت کی ہو ایسی غلطی رہ گئی ہو اور پھر خصوصیت یہ کہ ان تین حافظوں میں دو تو خلفاء راشدین کے سرتاج حضرت ابوبکر و عمر تیسرے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گھر میں پلی ہوں اور ان کی تربیت میں نشوونما پائی ہو۔ اس پر بھی غلطی رہ جائے اور کسی کو خبر نہ ہو۔ میرے نزدیک ایسے اختلاف قرآن کے مٹانے کے لئے جس کو خود حضور نے سن کر سمجھ کر جائز رکھا تھا اور خلیفۂ سوم کا قرآن کی نقل پر زید کو مامور کرنا اور اس کی نقل کے لئے باوجودیکہ خود زید کے پاس اپنا لکھا ہوا اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا ہوا قرآن موجود تھا۔ حضرت حفصہ سے قرآن شریف طلب کرنا اور باوجود اس کے کہ بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس پورا قرآن جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا لکھا ہوا موجود تھا۔ سورہ احزاب کی آخری آیتوں کا محض خزیمہ یا ابو خزیمہ کے پاس ملنا ایسی باتیں ہیں جو یا تو بالکل بے اصل ہیں یا درمیان کے کسی راوی کے بیان کی وہ غلطی ہے جو اقتضاء بشریت سے بعید نہیں ہے۔ بہر حال یہ تمام روایات بمقابلہ اس تواتر اور توارث کے جس سے قرآن ہمیں ملا ہے۔ لائق اعتبار نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

ماخوذ از تاریخ القرآن از مفتی عبداللطیف رحمانی صفحہ ۱۴۳-۱۴۷

جمع القرآن کی احادیث پر تبصرہ

جمع القرآن کی احادیث پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ تمنا عمادی مجیبی پھلواری صاحب لکھتے ہیں۔

" حقیقت حال یہ ہے کہ یہ ساری داستان متعلق جمع قرآن بعہدِ صدیق اکبرؓ اور نقلِ مصاحف بعہدِ عثمانؓ اول سے آخر تک بالکل کذب و افترا اور بہتانِ عظیم ہے۔ نہ عہدِ صدیقی میں قرآن جمع ہوا، نہ عہدِ عثمانی میں اختلافِ قرأت تھے نہ ان کے مٹانے کیلئے کوئی کوشش کی گئی۔ نہ اس زمانے میں کہیں بھی کوئی سبعۃ احرف کے لفظ سے آشنا تھا۔ یہ ساری حدیثیں اور روائتیں ایک صدی کے بعد گھڑی جانے لگیں اور اسی زمانے سے اختلافِ قرأت کے فتنے کی ابتدا کی گئی۔ جس کے لئے انزل القرآن علی سبعۃ احرف کی حدیث گھڑ کر اس کو رفتہ رفتہ پہلے مشہور کیا جانے لگا۔ قرآن پاک کی کتابت عہدِ نبوی ہی سے ہر لکھا پڑھا صحابی اپنے لئے اپنے اہل و عیال کے لیے اپنے اعزہ اقرن اور پڑوسیوں کیلئے نقل پر نقل کر رہا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو کتاب دیکھ کر تلاوت کرنے کی برابر ترغیب فرماگئے تھے اس پر دونے ثواب کی بشارت دیا کرتے تھے۔ اسی لئے حفاظ قرآن بھی کتاب دیکھ کر ہی پڑھتے تھے۔ البتہ سفر میں مصحف ساتھ لے کر چلنے کی ممانعت تھی کہ کہیں دشمنوں کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ ازواجِ مطہرات حسبِ حکم واذکرن ما یتلی فی بیوتکن من آیات اللہ والحکمۃ (الاحزاب ۳۳ آیت ۳۴) پورا قرآن یاد کر چکی تھیں۔ اور ہر ایک کے پاس قرآن مصحف کی صورت میں لکھا ہوا موجود تھا۔ ان کے مصاحف کے کاتبوں کے نام تک کتابوں میں مذکور ہیں اور سب پوری طرح لکھنا جانتی تھیں۔ پھر صحابہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے تھے کہ قرآن کتنے دنوں میں

ختم کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن سے کم مدت میں ختم کرنے کی اجازت نہ دی۔
غرض اگر قرآن مرتب و مدون ہی نہ تھا تو ختم کرنے کا سوال کیوں اٹھا تھا اور پورا قرآن
لکھا ہوا مصحف کی شکل میں صحابہ کے پاس موجود نہ تھا تو کتاب دیکھ کر پڑھنے کا عام حکم
کیا معنی رکھتا ہے؟ اور سفر میں قرآن ساتھ لے کر چلنے کی ممانعت کے کیا معنی ہیں۔
قرآن کی آئیتیں، قرآن کی سورتیں سب مرتب و مدون اور پورا قرآن مصحف کی شکل میں ترتیب
کے ساتھ جس میں مرتب سورتیں تھیں اور ترتیب سورتوں کے ساتھ جو مصحف تھا ہزاروں
کی تعداد میں موجود تھا۔ حضرت صدیق اکبر کے وقت میں جمع قرآن کی ضرورت پیدا ہی
نہیں ہو سکتی تھی اور نہ جنگ یمامہ میں ستر حفاظ کرام کی شہادت سے ضیاع قرآن
بلکہ کسی ایک حرف کے بھی ضائع ہونے کا خطرہ محسوس نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس
وقت صحابہ و تابعین میں ستر ہزار سے زیادہ پورے قرآن کے حافظ موجود تھے۔ اور
ہزاروں نسخے مصحف کے لکھے ہوئے تھے اور تقریباً ہر روز ایک مصحف کا اضافہ ہو
رہا تھا۔ اس لئے حفظ و کتابت دونوں کا غیر منقطع سلسلہ عہد نبوی سے جاری تھا اور
جس طرح ہر روز چند حافظ فارغ التکمیل ہوتے تھے۔ اسی طرح ہر روز چند نسخے قرآن مبین
کے مکمل الکتابت ہوتے تھے اور بفضلہ تعالیٰ یہ سلسلہ اس وقت سے اس وقت تک
غیر منقطع تسلسل و تواتر کے ساتھ قائم ہے اور انشاء اللہ قیامت تک قائم رہے گا اور
چونکہ ہر مصحف اس پہلے بعینہٖ نقل تھا۔ جس کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوایا
تھا اور جس کی امین ام المومنین حضرت حفصہ قرار دی گئی تھیں۔ جس کا نام الامام یا الام
تھا۔ اس لئے ہر مصحف میں وہی رسم الخط تھا جو الامام کا تھا اور چونکہ ہر صحابی کی قرأت
خاص تلقین نبوی تک منتہی ہوتی تھی۔ اس لئے تلفظ میں بھی باہم اختلاف ناممکن تھا۔
اگر کسی صحابی کو بھول چوک بھی ہو جاتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بار بار کی تلاوت
نمازوں میں اور نماز سے باہر سُن سن کر ہر بھولنے والے کی یاد دہانی ہوتی رہتی تھی اور

صحابہؓ خود آپس میں بھی دَور کیا کرتے تھے۔ اپنے اہل و عیال کے ساتھ بھی دَور کیا کرتے تھے۔ اسی لئے کسی طرح کے اختلافِ قرأت کا وہم بھی نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابی بن کعبؓ وغیرہ کی الگ الگ قرأتیں اور ان کے الگ الگ مصحف ایک دوسرے سے مختلف محض منافقین عجم کے فتنے ہیں جس کو انہوں نے کوفہ میں بیٹھ کر بعض کوفی منافق طینتوں کو اپنا شریک کار بنا کر کھڑا کیا تھا۔

اس وقت ان منافقینِ عجم کی ایک بہت بڑی جماعت خلافت بنو امیہ کیخلاف ہر ملک اسلامی میں سازشیں کر رہی پھرتی تھیں۔ جس کا اصل مرکز خراسان تھا اور دوسرا مرکز کوفہ اور دوسری جماعت جھوٹی جھوٹی حدیثیں بنا بنا کر اصل دین کی تخریب میں لگی ہوئی تھی۔ صرف جھوٹی حدیثوں سے دین کی پوری تخریب کاری ہوتی نظر نہ آئی تو پہلی صدی ختم ہونے کے بعد اس جماعتِ مفسدین نے نفسِ قرآن میں ہاتھ لگایا اور انزل القرآن علی سبعۃ احرف کی حدیث بنا کر پہلے اس کو مشہور کیا۔ اس وقت جمع احادیث کا ایک ہوکا ابن شہاب زہری اور ان کے توابع اور بعض ہمعصروں کو تھا۔ بقول ابنِ حجر کے کلمہ سمعوا شیئًا علقوہ جو کچھ سنا ٹانک لیا۔ یہ سبعہ احرف والی حدیث بھی یاروں نے لکھی اور پھر ان سے ان کے تلامذہ نے لی۔ ان سے ان کے تلامذہ نے روایت کو درایت پر مقدم سمجھنے کا اصول ان منافقین راویانِ حدیث نے ان بھولے بھالے جامعین کے پوری طرح ذہن نشین کرا دیا تھا۔

بنی اُمیّہ کی خلافت کا خاتمہ اور حکومتِ بنی عباس کے دَور کا آغاز

پھر جب بنی امیہ کا آخری خلیفہ مروان الحمار ماہ صفر ۱۳۲ھ کے اواخر ایام میں مارا گیا اور بنی عباس کا پہلا خلیفہ سفاح یعنی عبداللہ بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس رضؓ ۳۔ ربیع الاول ۱۳۲ھ کو زمامِ خلافت کے مالک ہوئے۔ چونکہ بنی عباس اور منافقین ایران

میں خفیہ سمجھوتہ ہو چکا تھا اور بنی عباس ان کو منافق جانتے تو نہ تھے بلکہ اپنا محسن سمجھتے تھے کہ انہی کی جد و جہد اور کوششوں سے ان کو خلافت ملی۔ اس لیے ان سے بڑی حد تک حسن سلوک اور حسنِ معاملہ رکھنے لگے اور ان منافقین نے اکثر سے بھی زیادہ مخرب دین روائتیں بنا بنا کر حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہی کی طرف منسوب کر کر کے مشہور کرنا شروع کر دیں۔ اس سلسلہ میں اختلافِ قرات کی روائتیں بھی بنائیں اور چونکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ایک مُدت دراز تک کوفے میں رہے تھے۔ اس لئے اختلاف قائم رکھنے کا بہتان انہی پر باندھا اور مشہور یہ کیا کہ عہدِ نبوی سے عہدِ شیخین تک بلکہ فتح آرمینیہ سے قبل تک تمام مسلمان ہر جگہ مختلف ہی قراتوں سے قرآن پڑھا کرتے تھے۔ حذیفہ بن الیمان کی شکایت پر حضرت عثمانؓ نے صحابہ کے مشورے سے تمام امت کو ایک قرات پر جمع کر دیا۔ ہم یہ لکھ چکے ہیں کہ صرف چند نسخے لکھوا کر اور مختلف ممالک میں بھیج کر وہ بھی بغیر اعراب اور نقطوں کے مصاحف کے ذریعے حضرت عثمانؓ کبھی تمام دنیا سے اختلافِ قرأت کو مٹا نہیں سکتے تھے۔ لفظوں اور اعراب کے اختلافات جو سینکڑوں کی تعداد میں قرأت کتابوں میں بھرے ہوئے ہیں۔ ان کو بے نقطے اور بے اعراب کا مصحف کس طرح مٹا سکتا تھا۔ جب تک ہر مصحف کے ساتھ حضرت عثمانؓ ایک قریشی قاری یعنی حافظِ قرآن بھی ہر شہر میں نہ بھیج دیتے جو لفظوں اور اعراب کے اختلاف کو مٹا دیتا اور لب و لہجہ کے فرق کو بتاتا۔ غرض یہ ہے کہ اگر ایک صاحبِ عقلِ سلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی صحابہؓ کی زندگی اور قرآن کی اہمیت پر غور کر لینے اور سمجھ لینے کے بعد ان حدیثوں پر منصفانہ نگاہِ تنقید ڈالے اور راویان و جامعین احادیث کی سطوت سے مرعوب نہ ہو تو فوراً ان ساری حدیثوں کو جو جمع قرآن کے متعلق مروی ہیں۔ بلا تامل موضوع و کذب و افتراء کہہ دے گا۔ مگر جامعینِ احادیث کی سطوت ہمارے علمائے کرام پر اس قدر غالب ہے کہ یہ قرآن کو مشتبہ اور مختلف فی مان لینے کے

لئے تیار ہیں مگر صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی کسی حدیث کو بھی موضوع ماننے کیلئے تیار نہیں۔ قرآن مشتبہ ہو تو ہو، رسول پر الزام آئے تو آئے۔ صحابہ پر تہمت لگے تو لگے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ حفاظت و جمع قرآن جھوٹا ٹھہرے تو ٹھہرے۔ مگر ان دفاتر کی کوئی حدیث جھوٹی نہ ثابت ہو۔ اس کا کیا جواب ہے۔ سب سے زیادہ تعجب تو یہ ہے کہ ان حدیثوں کی کمزوریاں ان کو کبھی نظر ہی نہیں آتیں اور جو نظر بھی آتی ہیں تو ان کی رکیک سے رکیک تاویل کرکے اپنے دل کو سمجھا لیتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ علمائے محدثین اگلے ہوں کہ پچھلے انہوں نے ان راویانِ حدیث کو جو اولاد السبایا خود سبایا میں سے تھے اور ان میں سے کتنے موالی صحابہ ہونے کی وجہ سے ان کے قبائل کی طرف منسوب تھے۔ کتنے مدنی بن بیٹھے تھے اور پھر تابعین میں شمار کئے جاتے تھے۔ اس لئے یہ جامعین احادیث ان تابعین کو اگر مشتبہ قرار دیتے تو پھر سارا ذخیرہ احادیث مشتبہ ہو جاتا اور ان کو جو جمع احادیث کا شوق اور ولولہ تھا۔ اس کا بالکل خون ہو جاتا اور چونکہ ان منافقین کو بھی جو لوگ منافق نہیں سمجھتے تھے اس لئے تابعی ثقہ کا سرٹیفکیٹ دے کر ان کی ہر جھوٹی سچی روایت کو لکھ لیا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض ہی ایسے نکلے جن کا کذب و افترا ظاہر ہو گیا۔ تو بعد والوں نے جب کافی شہادتیں پا لیں تو ان کو غیر معتبر قرار دیا۔ ورنہ اگر کسی نے کچھ الزام لگایا بھی تو دوسرے نے ثقہ سمجھ کر سنبھال لیا۔ اس لئے آج اس قسم کی ہزاروں حدیثیں صحاح و غیر صحاح میں نظر آ رہی ہیں اور اختلافِ قرأت پر تو ضخیم ضخیم کتابیں مستقل طور سے شائع ہو چکی ہیں۔ اور ہمارے علمائے کرام کے لئے ذخیرہ امتحان بنی ہوئی ہیں۔

ماخوذ از جمع القرآن از علامہ تمنا عمادی صفحہ ۳۰۷ سے ۳۱۲۔
شائع کردہ الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ رجسٹرڈ مکان نمبر ۳-۳ اے بلاک نمبر ۱ ناظم آباد کراچی

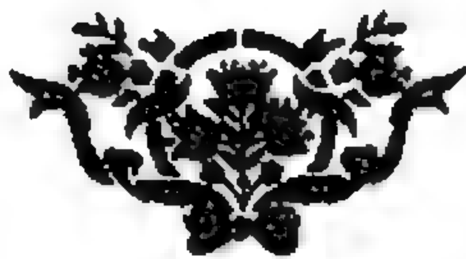
اس کے بعد علامہ تمنا عمادی لکھتے ہیں:۔

" مختصر یہ ہے کہ قرآنِ مجید کتابی صورت میں عہدِ نبوی میں مدون و مرتب بالکل اسی ترتیب سے تھا جس طرح دنیائے اسلام کے ہر سچے مسلم کے گھر میں آج موجود ہے اور ہر صحابی کے گھر مرد، عورت، بوڑھے، جوان، ذی شعور بچوں اور بچیوں کی روزانہ تلاوت میں تھا۔ اس کو مصحفِ عثمانی کہنا اور حضرت عثمان کو جامع قرآن کہنا، منافقینِ عجم دشمنانِ اسلام کے جھوٹے پراپیگنڈے کے سبب سے ہے۔ پہلے تو ان عجمی منافقین نے تابعین کا لبادہ اوڑھ کر راویانِ حدیث بن کر عہدِ نبوی سے جو قرآن مجید قرأتاً، تلاوتاً، کتابتاً حفظاً اور تعلیماً ہر حیثیت سے بے شک تواتر کے ساتھ ہر صحابی۔ ہر تابعی۔ ہر تبع تابعی کے گھر میں چلا آرہا تھا۔ اس کو مصحفِ عثمانی مشہور کیا تاکہ مسلمانوں کا ایک فرقہ جو حضرت عثمان سے عناد رکھتا ہے اور کوفہ بصرہ اور مصر میں جو حضرت عثمان کے قاتلین کے ذریات ہیں وہ قرآنِ مجید سے تعصب برتنے لگیں۔ ادھر قرآن مجید میں اختلافِ قرات کا پروپیگنڈہ جاری کرکے کوفہ سے قاریوں کا جال پھیلانا شروع کیا اور پہلی صدی کے ختم ہونے کے بعد سات قاری بھی بنا لئے۔ ان میں سے حفص بن سلیمان الکوفی جو سارے محدثین کے نزدیک بالاتفاق متروک الحدیث۔ ذاہب الحدیث۔ غیر ثقہ۔ منکر الحدیث اور راویِٔ موضوعات تھا جس کو ابنِ فراش نے کذاب کہا اور ابن معین نے بھی کذاب کہا اور ابنِ حبان نے لکھا کہ یہ اسنادِ حدیث میں الٹ پلٹ کر دیتا تھا اور مرسل کو مرفوع بنا دیا کرتا تھا۔ اس کی طرف اس متواتر قرآنِ مجید کی قرأت منسوب کی اور دوسرے قاریوں کو ثقہ قرار دیا مگر چونکہ اسی متواتر قرأت کو اسی کی طرف منسوب کیا۔ اس لئے قرأت میں اس کو ثقہ اور اس کی قرأت کو اصح بتایا یہ سمجھتے ہوئے کہ حفص بن سلیمان جیسے مشہور غیر ثقہ کذاب کی طرف ہمارے منسوب کر دینے سے کوئی بھی اس وقت اس متواتر قرأت کو چھوڑ تو دے گا نہیں۔ اس لئے مشہور کذاب کو قرأت میں سچا اور ثقہ ٹھہرایا۔ اور مقابلے کے لئے حمزۃ الزیات کوفی کو قرأت میں بدترین قاری مگر حدیث

میں ثقہ مشہور کیا۔ حفص کی پیدائش سنہ ۹۰ھ کی اور حمزہ کی سنہ ۸۰ھ کی لکھی ہے۔ حفص کی موت سنہ ۱۸۰ھ میں واقع ہوئی اور حمزہ کی موت سنہ ۱۵۸ھ میں۔

"غرض منافقین کوفہ نے قرآنِ مجید کو مشکوک و مشتبہ بلکہ غیر معتبر ثابت کرنے کی محیر العقول کوشش کی کہ ان مفسدین کی اتنی بڑی زبردست سازش کس طرح ساری دنیائے اسلام میں پھیل کر رہی اور سارے محدثین، مفسرین اور فقہاء نے ان کے کذب افتراء کو امر واقعی اور صحیح تسلیم کر لیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے ذکر میں ہر مؤرخ جمع قرآن کا ذکر کرنے لگا اور حضرت عثمانؓ کا تو لقب ہی جامع قرآن بن گیا۔ یہ نہ سمجھئے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمان کی اس جھوٹی منقبت میں قرآنِ مجید کی کس قدر منقصت پنہاں ہے۔ جن کے دلوں میں قرآن مجید ہی کے متعلق شکوک پیدا ہوں گے۔ ان کو ابوبکر و عمر، عثمان و علی رضی اللہ عنہم کی محبت کیا کام آئے گی؟ مگر قربان جایئے وعدۂ حفاظتِ اللہ تبارک و تعالیٰ کے کہ اتنی بڑی زبردست سازش جو رفتہ رفتہ مسلمانوں کے عقائد میں داخل ہو گئی۔ اس کے باوجود قرآن مجید کے دامن تقدس پر ایک ہلکا سا غبار بھی بار نہ پاسکا۔

(ماخوذ از۔ جمع القرآن از علامہ تمنا عمادی صہ ۳۳۲۔ ۳۳۰)



قرآن کریم روایات کے آئینے میں

یہ مضمون مولانا عمر احمد عثمانی نے علامہ تمنا عمادی کے مضمون جمع القرآن کے مطالعہ سے متاثر ہوکر تحریر کیا اور مولانا ممدوح کی پسندیدگی کے بعد شائع کیا۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے کو

" دین کا مدار تمام تر یقین پر ہے۔ یہی وہ اصل بنیاد ہے جس پر اس کی پوری کی پوری عمارت اٹھتی ہے۔ یقین اس امر کا کہ جس بات کو ہم دین کہتے ہیں وہ بلاشک و شبہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اگر اس دنیا میں ذرا سا بھی تزلزل پیدا ہو جائے تو دین کی ساری عمارت نیچے آگرتی ہے۔ اس میں تھوڑے اور بہت کا سوال ہی نہیں۔ مثلاً ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اپنی وحی نازل کی اور اصل و بنیاد کے اعتبار سے انہیں بھی وہی " دین عطا کیا جو قرآن میں ہے۔ آج یہود و نصاریٰ دونوں اس کے مدعی ہیں کہ ان کے پاس تورات اور انجیل موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم ان کتابوں کو دین نہیں مانتے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے اور وہ یہ کہ ان کتابوں میں تغیر و تبدل ہو چکا ہے اور ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ جو کچھ ان میں موجود ہے وہ وہی ہے جو ان انبیاء علیہم السلام کی طرف نازل ہوا تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں کچھ باتیں تو ایسی ہوں گی جن میں رد و بدل نہیں ہوا۔ ان باتوں کو تو دین ماننا چاہیئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان میں کچھ باتیں ایسی ضرور ہوں گی لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ دین کے جس معاملہ میں ذرا سا بھی شک اور شبہ پیدا ہو جائے وہ دین ہی نہیں رہ سکتا۔ اس لئے تورات و انجیل دینی کتابیں نہیں تسلیم کی جا سکتیں۔ اس کے برعکس قرآنِ کریم کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ یہ لفظاً لفظاً، حرفاً حرفاً

الحمد سے والناس تک بعینہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کیا اور جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو دیا۔ اب سوچئے کہ اگر کسی کے دل میں اس چیز کے متعلق ذرا سا بھی شبہ پیدا ہو جائے تو اس کے نزدیک قرآن دین کا ضابطہ نہیں بن سکتا۔ اس کی حیثیت بھی وہی ہو جائے گی جو انجیل اور تورات کی ہے۔

عجمی سازشوں نے جہاں حقیقی اسلام کی جگہ ایک بالکل نیا اسلام وضع کر کے مسلمانوں میں عام کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے چپکے چپکے ایسی کوششیں بھی کیں جن سے ہر شخص کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو جائے کہ قرآن بھی اپنی اصلی حالت میں محفوظ نہیں رہا۔ یہ اس سازش کا اتنا بڑا حربہ تھا جس نے فی الواقعہ دین کی عمارت کو متزلزل کر دیا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے قرآن کی جمع و تدوین کے متعلق عجیب و غریب داستانیں وضع کیں۔ اور انہیں روایات کے مجموعوں میں بھر دیا۔"

عجمی سازشیں کیوں؟

"سیاسی میدان میں مسلمانوں سے شکست کھانے کے بعد جب اہلِ علم نے دیکھا کہ ان کی فرعونی افواج قاہرہ اور طاغوتی اسلحہ جنگ اور مسلمانوں کے کوہ آسا عزم و یقین (ایمانی طاقت) کو متزلزل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے تو انہوں نے بظاہر مسلمان بن کر مسلمانوں کو ان کے سرچشمۂ عزم و یقین (قرآنِ پاک) ہی سے محروم کر دینے کی ٹھان لی جو ان کی قوت کا اصل منبع تھا۔ اس کے لئے اس کی دشواری یہ تھی کہ مسلمان "حسبنا کتب اللہ" کا مدعی تھا۔ یعنی اس کا ایمان تھا کہ اس کی قوتوں کا راز دین کی اتباع میں ہے۔ جو قرآن کے اندر ہے اور قرآن کریم ہر طرح محفوظ ہو چکا تھا۔ اس لئے اس کا کوئی لفظ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹایا جا سکتا تھا۔ اندریں حالات عجمی سازش نے یہ سوچا کہ مسلمانوں کو قرآن سے ہٹانے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ انہیں اپنے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے

جو والہانہ عشق ہے اس سے فائدہ اٹھایا جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر ۔ مثلہٗ معہٗ ‘‘ کا عقیدہ پیدا کر کے مسلمانوں کے ہاتھوں میں قرآن کے متبادل ایک دوسرا دین دے دیا جائے ۔ چنانچہ عجم کے سازشی اپنی ان کوششوں میں مصروف ہو گئے مسلمانوں کی اکثریت اس فریب میں بہہ نکلی مگر کچھ اللہ کے بندوں نے اس سیلاب کا راستہ روکنا چاہا (کتاب الام میں امام شافعی سے ان لوگوں کے مباحث اور مناظر کا تذکرہ موجود ہے) عجم کی ان سازشوں کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ پڑتا تھا کہ اگر احادیث و روایات بھی دین تھیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی طرح ان کا بھی کوئی مستند مجموعہ لکھوا کر امت کو کیوں نہ دے دیا اور قرآن کریم ہی کی طرح ان کو بھی یاد کرا کر محفوظ کیوں نہ کر دیا ۔ اگر قرآن متن تھا اور حدیث اس کی شرح تھی ۔ اگر قرآن اجمال تھا اور حدیث اس کی تفصیل تھی ۔ اگر قرآن ایک ایسی کتاب تھی جو احادیث سے منسوخ بھی ہو سکتی تھی اور اس طرح حدیث ہی فیصلہ کن چیز تھی تو قرآن سے زیادہ احادیث کو محفوظ اور مستند صورت میں امت کے حوالے کرنے کی ضرورت تھی ۔ یہ اتنا بڑا اعتراض تھا جس سے گلوخلاصی آسان نہیں تھی ۔ انہوں نے اس مشکل کا حل یہ سوچا کہ خود قرآن کے متعلق ہی یہ خیال پھیلا دیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بھی محفوظ شکل میں امت کو نہیں دیا تھا ۔ اسے بھی بعد میں آنے والوں نے مرتب و مدون کیا تھا اور جس طرح احادیث کے بیانات میں آپ کو اختلافات نظر آتے ہیں ۔ ایسے ہی (معاذ اللہ) قرآن کریم میں بھی صحابہ اور تابعین کے زمانے میں کافی اختلافات موجود تھے ۔ جس طرح روائتیں خبرِ واحد ہیں کہ کسی ایک صحابی نے بیان کی ہیں ۔ اسی طرح قرآن کی آیتیں بھی ایک ایک دو دو آدمیوں کے بیان پر جمع کر لی گئی ہیں ۔ وغیرہ ذالک من الخرافات ۔ چنانچہ اس مقصد کیلئے انہوں نے احادیث وضع کیں اور ان کی عام تشہیر کر دی ۔ یہ روایات احادیث کے مجموعوں میں آج بھی موجود ہیں ۔ اس ضمن میں حافظ ابوبکر عبداللہ ابن ابی داؤد سلیمان ابنِ اشعث سجستانی کی شہرہ آفاق کتاب

"کتاب المصاحف" ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس میں قرآن کریم سے متعلق ان تمام روایات کو یکجا جمع کر دیا گیا ہے۔ یہ روائتیں اکثر صحاح ستہ اور دوسری مستند کتب روایات میں منتشر طور پر موجود ہیں۔

ماخوذ از جمع القرآن صفحہ ۳۲۴ تا ۳۲۷۔ شائع کردہ الرحمان پبلشنگ ٹرسٹ رجسٹرڈ بلاک نمبر ۱ ناظم آباد کراچی۔

امام زہری اور جمع القرآن کی روایت

علامہ تمنا عمادی ، جمع القرآن کی روایت گھڑنے اور پھیلانے میں جو کلیدی کردار امام زہری نے ادا کیا اس کے متعلق تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

"تو حضرت حفصہ کے پاس وہی مصحف تھا جو کاتبین وحی سے نزول آیات کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھوایا جاتا تھا۔ اس نسخہ مصحف کے اس شرف کو لوگوں کے ذہنوں سے نسیاً منسیاً کر دینے کے لئے جمع قرآن بعہد صدیق اکبرؓ کا ایک فرضی واقعہ گھڑ لیا گیا اور اس کی ایک محض جھوٹی روایت بنا کر حضرت زید بن ثابت کی طرف منسوب کر کے عبید بن السباق کے ذریعے زہری تک پہنچا دی گئی۔ زہری نے اِن کو اللہ جانے اپنے کن کن شاگردوں کے سامنے پیش کیا۔ مگر زہری کے سینکڑوں شاگردوں میں سے صرف چار نے اس روایت کو قبول کیا۔ شعیب بن ابی حمزۃ الحمصی تو زہری کے کاتب یعنی پرائیویٹ سکرٹری ہی تھے۔ اس کی روایت سے کس طرح انکار کر سکتے تھے۔ ان کے علاوہ ابراہیم بن سعد جو زہری کے وقت تقریباً پندرہ برس کے تھے۔ اللہ جانے بالغ ہوئے تھے یا نہیں۔ اس کے سننے کے وقت تو اور بھی کمسن ہوں گے اس لئے ان کو عام طور سے زہری کی حدیثوں میں کمزور ہی سمجھا جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے زہری کو شاید دیکھا بھی نہ ہو۔ اس لئے کہ ایلہ میں رہتے تھے جو مصر کے

قریب ایک موضع تھا اور ابراہیم مدینہ طیبہ میں رہتے تھے۔ اپنی کم سنی کی وجہ سے زہری کی زندگی میں ایلا گئے بھی نہ ہوں گے۔ البتہ شیعوں کے یہاں یہ ثقہ اور حجۃ ہیں اور یونس بن یزید جو زہری کے ہم وطن یعنی ایلہ کے رہنے اور زہری سے سنکر حدیثیں روایت کرنے میں خاص طور سے مشہور ہیں۔ جن کو ابنِ سعد نے لا یحتج بہ لکھا ہے اور عبدالرحمٰن بن خالد جو ابراہیم بن سعد کی طرح شیعوں کے نزدیک تو ثقہ ہیں مگر اہل سنت محدثین ان کو منکرین الحدیث لکھتے ہیں۔ بس انہی لوگوں نے اس حدیث کا پروپیگنڈہ کیا۔ اگر اس حدیث کو صحیح بخاری میں جگہ نہ مل جاتی تو شاید ہی کوئی صاحب عقل ایسی خلافِ عقل جھوٹی روایت کو قبول کرتا۔ چاہے امام بخاری نے خود محض حمایتِ حدیث کی مصلحت کے ماتحت اس روایت کو قبول کر لیا ہو۔ چاہے امام بخاری کے کسی شاگرد نے یہ پورا باب "جمع القرآن" بنا کر ان کی کتاب میں ان کے بعد داخل کر کے پھر اس کے مختلف مقامات میں اس حدیث کو کہیں آدھی کہیں پوری ٹھونس دی ہو۔ بہر حال صحیح بخاری میں جب یہ حدیث بعد والوں کو نظر آئی تو پھر بعد والے بخاری پرستوں پر اس کی حمایت فرض ہوگئی اور ترمذی اور نسائی وغیرہ نے بھی اس کو اپنی کتاب میں درج کر لیا۔"

(ماخوذ از جمع القرآن صفحہ ۲۰۳ - ۲۰۴)

مولانا حکیم نیاز احمد فاضل دیوبند نے "روایت افک اور زہری" پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے جس سے امام زہری پر معلومات حاصل ہوتی ہیں جو درج ذیل ہے۔

"(۴) مفصل روایت افکِ زہری سے منقول ہے جو انہوں نے بقول خود چار تابعیوں سے سنی ہے اور ان چار ٹکڑوں کو مجموعہ بنا کر پیش کیا ہے۔ اب میں نے اس روایت کے متن اور سند کو پرکھا تو معلوم ہوا زہری نے اپنی ذاتی تاریخی معلومات سے دوسری صدی کے ربع اول میں یہ روایت مرتب کی ہے۔

(۵) اس کی سند کو دیکھا تو حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے

دَور میں اس روایت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ کوئی صحابی اس روایت کا راوی نہیں ہے۔ دَورِ تابعین میں اس کا وجود نہیں ہے۔ کوئی تابعی اس روایت کا راوی نہیں ہے صرف نسبت ہے۔

(٦) اس کی روایت کی اسناد کو دیکھا۔ زہری تک سلسلہ ملتا ہے اور آگے منقطع ہے۔

(٧) افک کی پوری تفصیل زہری کی روایت میں ہی ملتی ہے۔ اس سے باہر اجمال ابہام اور اہمال کے سوا کچھ نہیں ہے۔

(٨) اس روایت کا ایک کوفی اجمال مسروق کوفی سے منقول ہے جو امّ رومان کی نسبت سے بیان کیا گیا ہے۔ مگر اس کی سند مشکوک اور غیر معتبر ہے۔

(٩) محدثین نے احکام کی روایات کی خوب چھان بین کی ہے اور تاریخی روایات غیر منقطع بھی قبول کر لی ہیں۔ اس لئے طلبِ حدیث کے لئے ان روایات میں تحقیق اور تنقیح کی گنجائش موجود ہے۔

(١٠) زہری کی روایتِ افک کے علاوہ دیگر روایاتِ افک کی اسناد میں یا تدلیس ہے یا ارسال ہے یا ادراج ہے وہ سب مجروح ہیں۔

(١١) زہری کے حالات مفصل، رجال کی کتابوں میں نہ مل سکے اتنا معلوم ہو سکا کہ زہری مدلس بھی ہیں، مرسل بھی ہیں، مدرج بھی ہیں۔ سند کے تینوں عیوب ان کی روایات میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی متضاد روایات سے معلوم ہو رہا ہے کہ ان کا اصل مرض نفاق ہے۔

(١٢) مَیں نے مرویاتِ زہری کو تلاش کیا کہ کسی محدث نے زہری کی مرویات کو جمع کیا ہو۔ اس طرح زہریات ایک جگہ جمع مل جائیں گی۔ تو پتہ چلا کہ مشہور محدث امام محمد بن یحییٰ الذہلی نیشاپوری استاد بخاریؒ نے ایک کتاب علل حدیث الزہری رح لکھی تھی۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ مگر تلاش کے باوجود اس کا پتہ نہ چل سکا۔

پھر مَیں نے خود مرویاتِ زہری کو مختلف کتب حدیث سے جمع کیا۔ ان کا خلاصہ مَیں نے اپنی اس کتاب میں زہری کے حالات میں لکھ دیا ہے۔ اگر مَیں مرویاتِ زہری پر جو مَیں نے جمع کی تھیں۔ بحث کرتا تو ہزار صفحات سے اوپر ذخیرہ ہو جاتا۔ مگر چونکہ میرا مقصد تو عمرِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر کام کرنا تھا۔ اس لئے اس کو نظر انداز کرنا پڑا۔

(۱۳) روایتِ افک پر ضمنی بحث کرنے کا خیال تھا۔ مگر چونکہ یہ روایت منکرات پر مشتمل ہے۔ باب افک میں حرفِ آخر ہے۔ اس لیے اس پر بحث کرنی پڑی۔ اس لئے یہ حصہ بھی کافی طویل ہو گیا۔ اصل کتاب کشف الغمہ کا آدھا حصّہ انہیں مباحث نے گھیر لیا۔ گویا موے سے لمبی اس کی دم ہو گئی۔

(۱۴) اس حصّے کو مَیں نے مختصر کرنے کی کوشش کی مگر نہ کر سکا اس لئے اصل کتاب کو بغیر ان مباحث کے شائع کیا۔

۱۵ زہری ذوجہات شخصیت ہیں۔ ان کی ماہیت اور حقیقت پر مطلع ہونا مشکل ہے زہری متضاد روایات کے مرجع ہیں۔ جن کی توجیہہ اور تطبیق مشکل ہے۔ زہری انتشار اور افتراق کے بانی ہیں۔ زہری الجھی ہوئی ڈور ہیں۔ جس کا سِرا پالینا مشکل ہے۔ زہری کے معمّے کو حل کرنے کا آسان طریقہ یہ نظر آیا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ زہری نے زندگی کہاں اور کیسے گذاری۔ زہری جب علم سے فارغ ہوئے تو ۸۰ھ میں عبدالملک کے دربار میں پہنچ گئے اور عبدالملک کی اولاد کے اتالیق مقرر ہوئے۔ پھر ان کے احفاد کے بھی اتالیق رہے۔ آخر کار ۱۲۴ھ میں اسی عہدے پر بنو مروان کے دربار سے متعلق تھے کہ وفات پائی۔ یعنی ۴۵ سال بنو مروان کے ملازم رہے۔ بلکہ تمام عمر انہیں کی خدمت میں صرف کر دی۔

(۱۶) حقیقت میں ان میں وہ تمام صفات تھیں جو مطلق العنان بادشاہوں کے درباریوں میں ہوتی ہیں۔ نفاق۔ آقاؤں کی مزاج شناسی، موقع پرستی، سخن شناسی، سخن سازی

برمحل سخن پروری - بدیہہ گوئی - قدرتِ کلام ، مخالف ماحول کی برداشت - کامل ابن الوقتی حصولِ مقصد کے لطیف ذرائع کا شعور اور ان کا استعمال - عام انسانوں کی معمول سازی وغیرہ وغیرہ -

۱۷۔ مرویاتِ زہری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ کرام رض اور صحابیات رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق زہری سخت سیئ الرائے تھے - ان کی روایات میں جابجا اس کا اظہار ملتا ہے وہ آخرت کی باز پرس سے مستغنی تھے - ان کا دل خوفِ خدا سے خالی تھا -

۱۸۔ روایات کی تنقیح کے متعلق ہماری کتاب کشف الغمہ میں تمام مباحث تفصیل سے آ چکے ہیں - دوبارہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں - من یشاء فلیراجع الیہ اگر تفصیل دیکھنی ہو تو اس کا مطالعہ کریں -

۱۹۔ مگر قبولِ خبر کے مختصر ضوابط بیان کئے دیتے ہیں تاکہ ان کی روشنی میں تاریخی روایات کو پرکھا جائے اور قبول کیا جائے -

ا نص قطعی کے خلاف روایات مردود ہوں گی -

ب منصبِ نبوت کے خلاف روایت مردود ہے -

ج سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو داغدار کرنے والی روایت مردود ہے -

ہ کردار صحابہ کرام میں ایک مستقل قدر ہے - حضرات صحابہ کی کردار کشی کی تمام روایات مسترد ہیں - خصوصیات سے السابقون الاولون کیلئے رضاء الٰہی نص ثابت ہے - اس لئے ان کی کردار کشی کی روایات نص مردود ہیں -

ز بنیادی اسلامی تعلیمات کے خلاف تمام روایات مردود ہیں -

ک یہ ایک معروف حقیقت ہے کہ تاریخی روایات غیر منقح ہیں - ان کی گنجائش خود محدثین نے رکھی ہے - اس لئے تنقیح کے بعد قابلِ قبول ہوں گی -

(ح) مدلس، مرسل، مدرج روایات کی زیادہ چھان بین کی ضرورت ہے۔ اصل روایت اور سند پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ ادراج بعد میں کیا جاتا ہے اور اس کی شناخت مشکل ہو جاتی ہے۔ محض اضافہ ثقہ کے ضابطوں سے اسے قبول نہیں کریں گے۔

(ی) صحاح ستہ میں صرف احکام کی روایات ہی نہیں ہیں۔ بلکہ تاریخی، مغازی، ملاحم، فتن، مناقب، مثالب کی روایات بھی درج ہیں۔ مؤخر الذکر روایات اکثر غیر منقح ہیں اور ان میں تسامح بھی پایا جاتا ہے۔ اس لئے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے کردار کی روایات کو دیکھ بھال کر قبول کرنا چاہیئے۔ کیونکہ حضرات صحابہ کرامؓ اسلام کا براہِ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تربیت یافتہ طبقہ ہے۔ وہی اسلام کے اولین ناقل و عامل ہیں۔ اگر وہی طبقہ کچے کردار کا قرار دیا جائے تو دین کی تمام عمارت ناقابلِ اعتماد ہو گی۔ اس لئے تاویل اور توجیہہ کی بجائے صحابہ کرامؓ کو چھوڑ کر ان کے نیچے کے رواۃ پر جرح و قدح کے بعد ان کے بیان کو قبول کیا جائے یا رد کر دیا جائے۔

ہم نے روایت افک کو کم عمری کے ماخذ کے طور پر لیا تھا جب غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ روایت نہیں افسانہ ہے۔ کم عمری کے ماخذ کے طور سے تمام بحث تحقیق، عمر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا میں آ چکی ہے۔ میری تحقیق یہ ہے کہ زہری حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی کم عمری کی روایت کے راوی نہیں ہیں۔ عبدالرزاق نے ایک سند میں ان کا نام استعمال کیا ہے۔ زہری سنہ ۱۲۴ھ میں وفات پا گئے تھے اور کم عمری کی روایت سنہ ۱۲۵ھ میں منظر عام پر آئی۔

زہری کی روایت افک میں اس کی موضوع لہا اور رمی علیہا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کی گئی ہیں اور غضب یہ ہے کہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اپنی زبان سے یہ واقعہ بیان کرایا گیا۔ حالانکہ واقعہ میں یہ قصہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سامنے پیش نہیں آیا۔ اور نہ انہوں نے کبھی اسے بیان کیا۔ یہ زہری کی خود ساختہ برداختہ

روایت ہے۔ زہری نے از خود سند میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ان کے بھانجے عروہ کا نام استعمال کیا ہے۔ عروہ سے زہری کا نہ لقا ثابت ہے نہ سماع ثابت ہے (تفصیل تحقیق عمر حضرت عائشہ صدیقہ رض میں ہے) یہیں سے یہ عیاں ہے کہ زہری منافق ہیں اور مدلس ہیں۔ یہ روایت زہری نے تصنیف کی ہے۔ اس روایت کے سب سے پہلے راوی زہری ہیں۔ وہی اس روایت کے موجد ہیں اور اس روایت کی تہذیب اور تشہیر عبدالرزاق نے کی ہے۔

عرصے تک میں اور میرے ساتھی زہری کے حالات پر غور کرتے رہے اور زہری کی جلالتِ شان کے پیشِ نظر فیصلہ کرنے میں متامل رہے۔ پھر روایتِ زہری کی روشنی میں اور ان کی تضاد بیانی اور صحابہ کرام سے سوءِ ظن کی بناء پر ہم نے طے کر لیا کہ ممنوع التکلم قرآنی افک کو رائی سے پربت بنانے والے زہری ہیں۔ اس روایت کی سند موضوع ہے۔ زہری سے اوپر کا وجود نہیں ہے۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ مکی زندگی میں منافقین کا طبقہ نہیں تھا۔ مکی سورتوں میں اس طبقے کا ذکر نہیں ہے۔ مدینے کی زندگی میں جب اسلام ایک طاقت بن گیا۔ یہ طبقہ وجود میں آیا۔ مدنی سورتوں میں اس کا ذکر ہے۔ بیشتر منافق مدنی ہیں۔ جوں جوں اسلام قوی تر ہوتا گیا یہ منافق نفاق میں شدید تر ہوتے گئے۔ پھر ان میں مفتوح ممالک کے منافقین بھی شامل ہوتے چلے گئے اور ان کی ذریت بھی بڑھتی رہی اور ان کی سرگرمیاں خفیہ تر رہ کر عیاں کرتی رہیں۔ زہری حزب نفاق کے فرد ہیں۔ زہری کی تربیت اور راہنمائی نے بنو مروان کو اس انجام تک پہنچا دیا جو زہری چاہتے تھے۔ زہری کی وفات کے بعد صرف ۸ سال تک یہ سلطنت باقی رہ سکی۔ زہری کے تربیت یافتہ تلمیذ بادشاہوں کے ہاتھوں ہی یہ سلطنت ختم ہو گئی اور بنو مروان بھی ختم ہو گئے۔ بنو مروان کے لئے زہری کا وہی کردار ہے اور کامل کردار ہے۔ جو ابن علقمی کا کردار بنو عباس کیلئے ہے۔ لیکن ابن علقمی کا کردار ناقص

اور بھونڈا ہے۔ زہری کا کردار ناقص تام ہے، عیب ہے اور بے مثال ہے۔ کوئی شخص انگلی نہیں رکھ سکتا کہ زہری کا بنو مروان کی تباہی میں ہاتھ ہے۔ ابن علقمی نے بھی اسی کردار زہری کو برتا ہے مگر بے احتیاطی سے برتا ہے۔ اس لئے برہنہ ہوگیا۔ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ مستحق لعنت ٹھہرا۔ اپنے مدعو اور ممدوح ہلاکو خان کی نظروں سے بھی گر گیا۔ اور ہاتھ بھی کچھ نہیں آیا۔ تاریخ میں اسی حزب نفاق کے فرد نصیر الدین محقق طوسی بھی تھے۔ ابن علقمی اور محقق طوسی کی ملی بھگت سے سلطنت عباسیہ تباہ ہوئی۔

غرض سلطنت کے اکھاڑ بچھاڑ کے کھیل آسان نہیں اس میں بڑی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ زہری اس فن میں کامل تھے۔

۲۴۔ زہری تاریخ کے امام ہیں۔ بغیر سند کے ان کے اقوال معتبر خیال کئے جاتے ہیں۔ واقعتاً مستور الحال ہیں۔ ظاہراً شیعیت کے لبادہ میں ملبوس ہیں۔ ان پر گفتگو کرنا اپنے آپ کو ہدفِ مطاعن بنانا ہے مگر ہم ایمان بالرسل کے مکلف ہیں۔ اس لئے زہری پر قلم اٹھانا پڑا۔

۲۵۔ زہری کسی فقہی مسلک کے امام نہیں ہیں۔ محض تاریخ کے راوی ہیں۔ ان کا مقام وہ نہیں ہے جو آئمہ مسلک کا ہے۔ اس لئے زہری پر بحث سے کوئی مسلک مجروح نہیں ہوتا۔

۲۶۔ زہری آئمہ نقد میں سے نہیں ہیں صرف ناقلین روایت میں سے ہیں۔ جن میں رطب و یابس سب کچھ ہوتا ہے۔

۲۷۔ حجت حدیث کا ضابطہ احکام کی روایات سے متعلق ہو سکتا ہے۔ حجیت روایت کوئی اصول نہیں ہے۔ رطب و یابس میں کیا حجت ہے۔

۲۸۔ تلقی بالقبول کا اصول تاریخی روایت میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اس کا حوالہ بے محل ہے۔

۲۹۔ اب سے بیس سال پہلے میں نے اور میرے ساتھیوں نے اخی مولانا قاری حافظ الیف اللہ صاحب عثمانی فاضل دیوبند و مولانا حافظ عظمت اللہ صاحب فاضل دیوبند بانی مدرسہ تفہیم القرآن جھنگ صدر نے مرتب کیا تھا۔

۳۰۔ یہ دونوں مضمون تحقیق عمر حضرت عائشہ صدیقہ عفیفہ رضی اللہ عنہا اور روایت افک عائشہ اکٹھے ایک دم لکھے گئے تھے۔ اسلئے حدیث پر ابحاث اکٹھے ہی تھے۔ بعد میں روایت افک بعض علماء کے مشورہ سے علیحدہ کر دی گئی۔ اسلئے قاری کے لئے مناسب ہے کہ پہلے تحقیق عمر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اصولی مباحث پر نظر ثانی کرے پھر اس کتاب کو پڑھے۔

۳۱۔ تکرار روایت کے پیش نظر کہیں کہیں استدلال میں تکرار آگیا ہے۔ اس کو دانستہ باقی رکھا گیا ہے تاکہ ذہن نشین ہو جائے۔

۳۲۔ بعض جگہ تنقید میں لہجہ سخت ہو گیا ہے اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

۳۳۔ شروع میں یہ مضمون ذاتی قلبی تسکین کے لئے لکھا گیا تھا۔ شائع کرنے کا خیال نہیں تھا۔ مگر بعد میں عام فائدے کے لئے تحقیق عمر حضرت عائشہ صدیقہ رضہ کو شائع کر دیا۔ اس لئے اب حصے کو بھی حسب وعدہ شائع کر رہا ہوں۔

۳۴۔ میں ہرگز منکر سنت و حدیث نہیں ہوں۔ یہ صرف ایک تاریخی روایت کی تنقیح اور تنقید ہے۔

۳۵۔ زہری پر اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا۔ کتب رجال میں ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہوا ہے وہی نقل کیا گیا۔ یعنے مدلس، مرسل مدرج ہیں۔

البتہ ان کی مرویات کی روشنی میں ان کو ذو وجہات شخصیت قرار دیا گیا۔ اور بعض خصوصیات کی بناء پر حزب نفاق کا فرد تصور کیا گیا۔ یہ آخری صفت ان میں میں نے اپنے مطالعہ کی بناء پر معلوم کی۔

جب زہری السابقون الاولون کو ایک دوسرے کی زبان سے منافق کہلواتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ان کی یہ گفتگو نقل کرتے ہیں اور ان کی ساری گفتگو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کی زبان سے ادا کرلاتے ہیں۔ تو اب ہمارے لئے دو ہی راستے ہیں۔ زہری کی روایت پر اعتماد کر کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کو بے اثر تصور کریں۔ السابقون الاولون کو جاہلیت میں گرفتار، بے کردار، نبی کی شان میں گستاخ خیال کریں۔ اور ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آپس میں حاسد تریا چلتر کی ماہر اور نبی علیہ السلام کی صحبت سے غیر مستفیض بے اثر کوری دنیا دار بیویاں تسلیم کریں اور سورہ احزاب کی آیت۔

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا۔

ترجمہ: تحقیق مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں اور فرمانبرداری والے مرد اور فرمانبرداری کرنے والی عورتیں اور سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والی عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں۔ اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں۔ اور بکثرت اللہ کو یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں۔ ان سب کے لئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

ایسی مبینہ صفات سے ان کو عاری اور بے گانہ خیال کریں۔ یا زہری کی اس روایت کو ناقابلِ اعتماد تصور کر کے زہری کو حزبِ نفاق کا فرد تصور کریں۔ اور روایت افکِ عائشہؓ کو زہری کا خود ساختہ افسانہ سمجھ کر اپنے ایمان کی حفاظت کریں اور نبی اکرمؐ کی تعلیم و تربیت سے مایوس اور حضرات صحابہ کرام رضی سے بدظن نہ ہوں۔ ہم نے روایتِ زہری کو ناقابلِ اعتماد قرار دے کر اپنے آپ کو سوءِ ظن سے بچا لیا۔ ہم نے اہون البلیتین کا راستہ اختیار کیا۔ صحابہؓ اور صحابیاتؓ زہری کے کردار کو مشکوک قرار دیں۔ ہم ایمان بالرسل کے مکلف ہیں۔ ایمان بالزہری کے مکلف نہیں ہیں۔

(ماخوذ از امام زہری و امام طبری تصویر کا دوسرا رخ صفحہ ۲۰۱-۱۹۳)
شائع کردہ الرحمان پبلشنگ ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۳-۷، اے بلاک نمبر ۱۔ ناظم آباد کراچی۔

اس کے بعد مولانا حکیم نیاز احمد صاحب امام زہری کے مختلف پہلو علم الرجال کی رُو سے سامنے لانے کے بعد تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" ذخیرہ روایات میں زہری سے سب سے پہلے جس نے تشہیر کے لئے اس روایت کو پسند کیا وہ عبد الرزاق ہیں۔ اس روایت کی ایجاد کا شرف زہری کو حاصل ہے اور اس کی پہلی تشہیر کا شرف عبد الرزاق کو۔ یہ دونوں ہی حضرت عائشہ صدیقہؓ اور عام صحابہؓ کے بارے میں سیئ الرائے ہیں۔ عبد الرزاق اور زہری، محمد بن السائب کلبی کی طرح منافق بھی ہیں۔ اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ کلبی کی سبائیت زہری کے نفاق کا چربہ ہے۔ کلبی کی تاریخی روایات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اس لئے اس کی تاریخی داستان بے اثر ہے۔ اربابِ سُنن اس کو کذاب تصور کرتے ہیں اور اس لئے اس کو متروک قرار دے دیا گیا۔

زہری تاریخ کے ابوالآباء ہیں۔ ان کے دماغ کے انعکاس کا نام تاریخ ہے

تاریخ ان کے ذہن کی پیداوار ہے۔ زہری مختلف فنون میں ماہر تھے۔ قرآن اور حدیث پر ان کی گہری نظر تھی۔ لغت و ادب پر کامل عبور تھا۔ اصنافِ سخن پر کامل قدرت تھی۔ شاہی دربار نے انہیں سیاست میں ماہر بنادیا تھا۔ کتمانِ حال پر قدرت اور اس کے ماہر تھے۔ درباری خصوصیات رکھتے تھے۔ ذوجہات شخصیت کے مالک تھے۔ عقیدہ کچھ تھا۔ عمل کچھ اور تھا۔ ۴۵ سال بنو مروان کے دربار سے متعلق رہے۔ کئی بادشاہوں کے اتالیق رہے۔ بعد کے بنو مروان بادشاہ انہیں کی تربیت سے بے راہ بنے اور ان کے مشوروں نے انہیں اس انجام تک پہنچا دیا۔ جو زہری چاہتے تھے۔ حافظہ قوی پایا تھا۔ اہل علم ان کے محتاج تھے۔ شاہی دولت نے ان کے وقار میں اضافہ کردیا تھا۔ عوام سے کم آمیزی نے انہیں عجوبہ روزگار بنادیا تھا۔ ظاہری رکھ رکھاؤ نے ان کی اصل شخصیت پر دبیز پردے ڈال دیئے تھے۔ ہر شخص کی رسائی ان کی بارگاہ تک مشکل تھی۔ ڈیوڑھی تھی۔ دربان تھے۔ علمی وقار تھا۔ دولت تھی۔ دبدبہ تھا۔ علم کی دولت سے مالا مال تھے۔ مخصوص تلامیذ کا ایک گروہ تھا۔ کوئی ماخذ کوئی دلیل پوچھنے والا نہ تھا۔ بے مزد تعلیم تھی۔ اس لئے احسان ہی احسان تھا۔ شاہی معلم تھے۔ مستند ہے "میرا فرمایا ہوا" کے مصداق تھے۔ کسی کے لئے مجالِ سوال نہ تھی۔ جو کہہ دیا وہی حجت تھا۔ دلِ خوفِ خدا سے خالی تھا۔ طبعًا منافق تھے۔ ظاہرًا ناصبی تھے۔ مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔
کتمانِ حال کے ماہر تھے۔ اپنی تعلیم میں اپنے مخصوص ذہنی زہر کو اس طرح سمویا کہ لوگوں کے ذہن سے حق و باطل کی تمیز اٹھ گئی۔ حضرات صحابہ کرامؓ کے حلیے کو اس طرح بگاڑا کہ شرفِ صحابیت کوئی چیز نہ رہی۔ اکثر روایات میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں صحابہ کرامؓ پر نیش زنی ضرور کی۔

مقصد یہ ہے کہ اصل زہری علماء کرام کی نظروں سے پوشیدہ رہے اور ظاہری زہری ثقاہت کے پردہ میں لپیٹے ہوئے روایات بیان کرتے رہے۔ ابنِ علقمی نے بھی

زہری کے کردار کو اپنایا مگر خام اپنایا۔

کلبی زہری سے متاخر ہے اور ان کا خوشہ چین ہے اور روح کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں ھذا ما عندی والعلم عند اللہ

ماخوذ از امام زہری، امام طبری تصویر کا دوسرا رخ صفحہ ۲۳۱-۲۳۰

علامہ عبداللطیف رحمانی صاحب اپنی کتاب "تاریخ القرآن" میں قرآن کریم کو کتابی شکل میں دینے کی روایات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تاریخ القرآن" کے حرف آغاز میں علامہ عبداللطیف رحمانی رحمۃ اللہ علیہ قمطراز ہیں:

" مسلمانوں نے اپنی کتاب قرآن پاک کی ایسی حفاظت کی کہ مخالفین کو بھی مجبوراً یہ اقرار کرنا پڑا کہ تمام مذاہب میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کا قانون یعنی آسمانی کتاب رسالت مآب کے مبارک عہد میں آج تک بلا کمی بیشی اور رد و بدل سے محفوظ ہے۔ اور آئندہ رہے گا کیونکہ قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جس کی حفاظت کا خدا تعالیٰ نے وعدہ فرمایا اور ذمہ لیا۔ بجز قرآن کوئی آسمانی کتاب ایسی نہیں جس کی حفاظت خدا تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہو۔ اس وقت یہ کلام پاک جن الفاظ اور ترتیب سے ہمارے سامنے ہے۔ اسی طرح بعینہٖ رسالت مآب کے مقدس عہد میں تھا۔ جن الفاظ اور ترتیب سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمایا۔ وہی بدستور اس وقت تک ہیں۔ ہمارے اس بیان کی تصدیق کے لئے اس وقت کے مسلمانوں کی حالت بھی اگرچہ روشن شہادت ہے کیونکہ آج تیرہ صدی کے بعد چودھویں صدی (ابتدائیں صدی) میں جبکہ مسلمانوں میں وہ مذہبی جوش نہیں ہے جو ہر فرقہ میں اپنی پیدائش کے وقت ابتدا میں فطرتی طور سے ہوا کرتا ہے۔ اور وہ محرک بھی نہیں ہے جو اپنی برقی قوت کی تاثیر سے ان کے دلوں میں اور خیالوں میں مذہبی رُوح اور حرکت پیدا کرتا ہے

لیکن اس پر بھی آج مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ حفاظِ قرآن اس کثرت سے ہیں کہ لاکھوں سے تجاوز کر کے کروڑوں تک پہنچے ہیں۔ اور مسلمانوں کی بہت کم ایسی آبادی ہو گی جہاں حفاظ نہ ہوں اور قرآن کے نسخوں سے تو شاید ہی کوئی بدنصیب اور منحوس گھر مسلمان کا خالی ہو۔ قرآن کا تھوڑا بہت روزانہ پڑھنا اور تلاوت کرنا ہر مسلمان اپنا فرض سمجھتا ہے اور ان کے مذہب میں یہ داخل ہے کہ وہ روزمرہ کی عبادت میں اسے پڑھیں اور رمضان میں تو پورا قرآن تراویح میں سننا اور پڑھنا ان کے مذہب میں داخل ہے۔ اس لئے مسلمان اپنے بچوں کو قرآن یاد کراتے ہیں اور یہ بچے کم و بیش اسے تین چار سال میں یاد کر لیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ پیغمبر اسلام اور ان کے ساتھیوں میں اپنے مذہب کی محبت اور جوش اور ان کے دل و دماغ خیال رگ پٹھوں میں ان کے جدید مذہب کا جو اثر ہو گا وہ ان کے بعد والوں میں ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اگر تمہارے دل میں ہمارے اس بیان کے باور کرنے میں تاریکی کا کوئی پردہ مانع ہو تو اس کے روشن کرنے کے لئے ہر جدید فرقہ کے اول لوگوں کی حالت کو دیکھو اور تاریخوں میں اس کا مطالعہ کرو۔ اس کے سوا بھی پیغمبرِ اسلامؐ اور ان کے ساتھیوں کی حالت بھی ہمارے اس بیان کیلئے مضبوط گواہ ہے۔ اب اس وقت مذہبی اثر۔ جوش۔ ذوق. شوق اور ولولہ اور ابتدائے اسلام کے اثر کو تو لو اور اس کے بعد انصاف سے اپنے دل میں سوچو کہ قرآن کے حفاظ کی تعداد اس وقت کے مسلمانوں میں ہے۔ اس وقت مسلمانوں میں ان کی تعداد کی رُو سے یہ حفاظ زیادہ ہوں گے یا کم. اس لئے یہ بھی خیال کرو کہ قرآن تیئس سال میں پورا ہوا۔ اس وقت کے یاد کرنے والوں کو تیئس سال کی مدت تھی اور ان کا حافظہ بھی اور ملکوں کے لوگوں سے فطرتاً قوی تھا۔ جس کی وجہ سے اتنی طویل مدت میں انہیں اس کا یاد کرنا اور لکھنا نہایت آسان تھا۔ بلا قصد بھی اس قدر مدت میں اس سرزمین کے لوگوں کو اِس

کا یاد ہونا ممکن تھا۔ چنانچہ ولیم میور سیرتِ محمدی میں لکھتے ہیں۔ قوتِ حافظہ ان کی انتہائی درجہ پر تھی اور اس کو وہ لوگ قرآن کی نسبت کمال سرگرمی میں لاتے تھے۔ ان کا حافظہ ایسا مضبوط تھا اور ان کی محنت ایسی قوی تھی کہ جب روائتِ قدیم اکثر اصحاب پیغمبر کی حیات میں بڑی صحت کے ساتھ تمام وحی کو حفظ پڑھ سکتے تھے

(الفرقانات صہ ۳۹)

ان واقعات سے اگرچہ یہ بات یقیناً ثابت ہے کہ کتابوں کی حفاظت کے جو ذرائع اور اسباب ہیں یعنی سینہ اور سفینہ۔ ان دونوں طریقوں سے پہلوں نے بھی قرآن کی حفاظت کی۔ جب کہ اس وقت بھی ان دونوں طریقوں سے حفاظت ہے۔ لیکن بعض روائتوں سے چونکہ ان لوگوں کے اس خیال کی تائید ہوتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن پورا مرتب رسولِ خدا کے مقدس زمانہ میں لکھا ہوا نہ تھا اور صحابہ میں دو چار کے سوا کوئی پورے قرآن کا حافظ نہ تھا۔" تاریخ القرآن صہ ۲۵-۲۴

اس کے بعد مزید فرماتے ہیں:۔

الغرض کسی کلام اور کتاب کے یاد کرنے اور لکھنے اور پاس محفوظ رکھنے کے چار سبب ہو سکتے ہیں۔

(۱) اس کے یاد کرنے میں کوئی مذہبی ثواب ہو اور مذہب کی طرف سے اس کی تاکید ہو۔ اگر کسی کتاب میں یہ خصوصیت ہو تو تنہا اسی کی وجہ سے وہ کتاب مرغوب اور پسندیدہ ہو جاتی ہے اور لوگ اسے لکھتے ہیں اور محفوظ رکھتے ہیں۔

(۲) کسی کتاب یا کلام کی یاد میں دنیاوی نفع یا عہدہ کی امید دلائی جائے تو اس وجہ سے بھی وہ یاد کی جاتی ہے۔ جیسے آج کل نصابِ امتحان کی کتابوں کی یاد میں طلبہ کس قدر محنتِ شاقہ اٹھاتے ہیں۔

(۳) کسی کے متعلق دنیاوی ضرورت ہو یا اخلاقی یا مذہبی۔ یعنی وہ قانونِ تمدن ہو یا

مذہبی تو اس کو بھی یاد کر لیتے ہیں اور اس کی نقلیں کرتے ہیں۔

۴۔ ہر جو کلام نہایت عمدہ اور خوب ہو، خصوصاً جب کہ وہ زبان اور معنی دونوں کے حسن سے آراستہ ہو اور بلاغت و فصاحت کے اعلیٰ زینہ پر ہو تو ایسا کلام بھی عام و خاص کی زبان پر ہوتا ہے اور عالم گیر شہرت اور قبولیتِ عام کی وجہ سے ہر شخص کے کانوں تک پہنچ جاتا ہے اور ملک کے ہر کس و ناکس کو یاد ہو جاتا ہے۔

" یہ چار وجہ ایسی ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کلام کے یاد کرنے اور لکھنے کیلئے مستقل اور کافی دلیل ہے اور اس وقت آپ کی ہزاروں مثالیں شہادت میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اب جس کلام اور کتاب میں یہ چاروں باتیں جمع ہو جائیں یعنی عہدِ مبارک میں قرآن پاک دنیاوی عہدوں کے لئے سند تھا۔ مذہبی ثواب میں کوئی اس کا ہمسر نہ تھا۔ اخلاقی، تمدنی، مذہبی، قانونی ہی فصاحت و بلاغت میں بھی اعلیٰ ہے تو کیا ان تمام وجوہ کا ایک جگہ جمع ہو جانا قرآن کے لکھنے اور یاد کرنے کے لئے روشن دلیل نہیں اور کیا اتنے اسباب کے جاننے کے بعد بھی اس وقت میں قرآن کے لاکھوں حفاظ کے ہونے میں شبہ ہو سکتا ہے اور کیا قطعی نہیں کہ اس سے بہت زیادہ تعداد میں اس وقت اس کے نسخے ہوں گے۔

جن واقعات کی تصدیق کے لئے ان کے علل اور اسباب کی شہادت ہو تو ایسے واقعات کے یقین کے لیئے اور ان کے باور کرنے اور ماننے کے لئے ہر قلب سلیم اور فہم مستقیم مستعد اور آمادہ پایا جاتا ہے اور ان واقعات کی بنیاد ایسے بلند مضبوط پہاڑ کی چٹان پر قائم ہے جہاں کسی قسم کی تاریکی، بطالت، کجروی کے شک و شبہ کا گرد و غبار بھی نہیں پہنچ سکتا اور نہ کسی قسم کا تزلزل اس میں پیدا کر سکتا ہے۔ بلکہ یہ شبہات اور توہمات جب اس چٹان سے ٹکراتے ہیں تو خود ہی پاش پاش ہو کر تارِ عنکبوت کی طرح اڑ جاتے ہیں "

(تاریخ القرآن صـ ۶۴ از علامہ عبداللطیف رحمانی)

اس کے علاوہ ایک اور مقام پر لکھتے ہیں؛

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں یہ ضروری تھا یا نہیں کہ رسولِ خدا نیز مسلمان قرآن کو پورا لکھتے۔

" قرآن مسلمانوں کے اعتقاد میں آسمانی کتاب ہے جس پر ان کے مذہب کی عمارت استوار ہے۔ اسلام کا دار و مدار اور اس کی بنیاد قرآن ہے۔ یہی قرآن رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا زندہ نشان ہے اور اسلام کی حقانیت کا روشن آفتاب۔ اسلام کے احکامات اور ہدایت کا سرچشمہ اور منبع قرآن ہی ہے اور اس کی تبلیغ کے واسطے آپؐ دنیا میں بھیجے گئے۔ اور اسی کی اشاعت اور تعلیم آپؐ کا اصلی منصب اور کام تھا۔ اس لئے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور نیز ہر ایک مسلمان کا فرضِ اوّل یہ تھا اور ہے کہ قرآن کی پوری اور کامل حفاظت کرے اور کیونکہ اسلام کی موت و حیات اور اس کا بقا صرف قرآن کی حفاظت پر منحصر ہے۔ قرآن کی حفاظت اسلام کی حفاظت ہے اور قرآن کی موت اسلام کی موت ہے اور مسلمان دنیا میں جس قدر پھلے پھولے وہ قرآن کی وجہ سے۔ اگر وہ اپنے مذہب کی اشاعت کر سکتے ہیں تو قرآن کی وجہ سے۔ اگر ان کے ہاتھ میں صداقت کا کوئی نشان ہے تو وہ قرآن ہے۔

" اب ایسی صورت میں یہ ناممکن ہے کہ عہدِ اوّل کے مسلمانوں نے قرآن کی حفاظت میں کسی قسم کی کمی کی ہو اور قرآن کی حفاظت کے جو اسباب و وسائل ہیں ان میں سے کسی کو چھوڑا ہو۔ کیونکہ موافق اور مخالف دونوں کو یہ اقرار ہے اور تاریخ بھی گواہ ہے کہ اپنے مذہب کی حفاظت اور حمایت میں جو کارِ نمایاں مسلمانوں کے ہیں اور جان و مال، راحت و آرام کی جس قدر قربانیاں مسلمانوں نے کیں اور مزاحمت کرنے والوں کا جو مقابلہ اہلِ اسلام نے کیا کوئی مذہب اس کے مقابلہ میں اپنے فرزندوں میں کسی کو پیش نہیں کر سکتا۔ جس نے مسلمانوں کی طرح سے اپنے مذہب کیلئے ایثار کیا ہو۔

اب کوئی اہلِ اسلام کے سامنے اس میدان میں آگے نہیں بڑھ سکتا۔

بانیٔ اسلام کے تمام اقوال وافعال کا مجموعہ مسلمانوں نے جس طرح تیار کیا اور اس کی تنقید اور تصحیح کی۔ کیا کوئی مذہب اسلام کے سوا بھی اپنے بانیوں کی ایسی مکمل اور منضبط تاریخ لا سکتا ہے۔ پس جس مذہب نے اپنے مذہب کے بانی کے اقوال اور افعال کی اس درجہ حفاظت کی ہو کہ اس میں وہ خود ہی ذی نظر ہوتے کہ خطرے کے طور پر بھی یہ بات خیال میں آسکتی ہے کہ اس نے آسمانی کتاب کی حفاظت میں کس قسم کا قصور کیا ہوگا یا اس کا ایک حرف یا نقطہ بھی ضائع ہونے دیا ہوگا

" اب یہ امر البتہ تنقیح طلب ہے کہ کسی کتاب یا کلام کی کامل حفاظت اور پوری حمایت کا کیا ایسا ذریعہ ہے جو لائق اعتبار ہو اور جس پر ایسا وثوق اور اعتماد ہو سکے جس میں تمام شک وشبہات کے راستے بند ہو جائیں۔ اور عین الیقین کے اول درجہ پر ہو۔

کتابوں وغیرہ کی حفاظت کے دو طریقے ہیں۔ اول یہ کہ ان کو سینہ کے صفحات میں جگہ دی جائے اور ان میں ان کو بند کر دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ قرطاس میں انہیں جمع کر کے محفوظ رکھا جائے۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ پہلی صورت بھی (یعنی یہ کہ کتاب لوگ یاد کر لیں) حفاظت کا ذریعہ ہے۔ لیکن انسان خواہ وہ کیسا ہی حافظہ قوی مستحکم رکھتا ہو۔ مگر بھول چوک سے جو انسان کے لوازمات سے اور اس کے خواص سے ہے کبھی پاک اور بالکلیہ جدا نہیں ہو سکتا۔ اور اس میں کسی کی کوئی تخصیص نہیں بلکہ تمام انسان اس میں یکساں شریک ہیں خواہ وہ نبی ہوں یا ولی یا فلاسفر ہو یا عامی"

اس کے علاوہ بے انتہا واقعات گذشتہ اور موجودہ ایسے ہیں جو انسان کی بھول چوک اور خطاء کی بیّن شہادت ہیں اور جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اب جب کہ انسان کی یاد اور حافظہ متہم ہے اور پورے اعتماد اور وثوق کے لائق نہیں

تو کوئی فہمیدہ انسان محض اسی کو سند نہیں بنا سکتا اور کسی کتاب کی حفاظت کا ذریعہ تنہا اسے قرار نہیں دے سکتا۔ ہاں اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قرطاس سے بھی کام لیا جائے اور جو نقش سینہ کے صفحوں پر کیا جائے وہی قرطاس پر بھی جمایا جائے یہ نقش واقعی قابلِ وثوق اور معتبر اور یقینی ہوگا۔ اس لئے دنیا میں ہر ملک و ملت میں عام طور سے اس کا رواج ہے کہ جب کسی شئے کا زیادہ اہتمام ہوتا ہے اور اس کو زیادہ مستحکم اور مضبوط اور قابلِ اطمینان کرنا منظور ہوتا ہے تو اس کو لکھ لیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن نے بھی ایسے معاملات کے لکھنے کا حکم دیا ہے جن کا یاد رکھنا ضروری ہے اور ان کو محض یاد پر نہیں چھوڑا۔ قرآن میں ہے۔ یاایھا الذین امنوا اذا تداینتم بدین اِلیٰ اَجَلٍ مُّسَمًّی فاکتبوہ ”اے مسلمانو! اگر تم ادھار کا معاملہ کرو اور اس کے ادا کے لئے ایک وقت مقرر کرو تو اس معاملے کو لکھ لو۔“

اس آیت سے چند باتیں معلوم ہوئیں۔

۱۔ یہ کہ مسلمان لکھنا پڑھنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جانتے تھے۔

۲۔ ایسی اشیاء اس وقت موجود تھیں جن پر لکھ پڑھ سکیں۔

۳۔ جن چیزوں کی حفاظت اور یاد رکھنے کی ضرورت ہے اس میں محض یاد پر بھروسا نہ کرو بلکہ اسے لکھ لیا کرو۔ اب مسلمان کو خدا ہی نے حکم دے دیا کہ حفاظت کی چیزوں کو لکھو اور یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے یہاں معاملات دنیاوی سے بہت زیادہ دین کے معاملات کی حفاظت کی ضرورت ہے خصوصاً قرآن کی۔ تو اس سے صاف یہ نتیجہ نکلا کہ خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ قرآن کو ضرور لکھو۔ اس کے سوا بھی لکھنے کے چند فائدے ہیں۔

۱۔ اول یہ کہ جب انسان سے بھول چوک اور خطا ممکن کیا بلکہ واقع ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ تمام انسان حافظہ اور یاد میں یکساں نہیں بلکہ مختلف ہیں۔ بعض کا حافظہ نہایت

قوی اور مضبوط ہے اور بعض کا نہایت ضعیف اور کمزور ہے اور بعض کا متوسط۔ اب اگر کوئی چیز بعض یاد پر ہی چھوڑ دی جائے اور لکھی نہ جائے تو یاد کرنے والے کسی وقت اگر اس میں اختلاف کریں اور ہر ایک کو اپنی یاد پر پورا بھروسا ہو تو اس اختلاف میں حکم اور اس کا فیصلہ بجز تحریر کچھ نہیں ہو سکتا۔ یا کسی شخص کو خود کسی وقت اپنی یاد میں شبہ ہو جائے تو تحریر سے وہ اپنے شبہ کو رفع کر سکتا ہے اس لئے بھی تحریر نہایت ضروری ہے۔

۲۔ دوسرے حفظ اور یاد ایسا خزانہ اور سرمایہ ہے جس سے انسان خود فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ زیادہ لوگ جو اس کے پاس ہوں اور جو اس سے جدا نہیں یا بعد میں ہوں وہ اس سے نفع نہیں اٹھا سکتے۔ کیا آج دنیا میں بے انتہا ایسے واقعات نہیں ہیں جو یاد اور حافظہ کے ساتھ ہی زمین میں مدفون ہیں اور واقفیت کے تمام ذرائع وہاں بیکار و معطل ہیں۔ اگر وہ سینہ سے نکل کر سیاہ لباس میں صفحات پر متمکن ہوتے۔ جس پر ہر شخص کی نگاہ پڑ سکتی اور ان کو دیکھتا تو آج کیوں وہ گمنامی کے تاریک غار میں ہوتے جس سے نکلنا انسان کی قدرت سے باہر ہے اور نہ وہاں کسی قسم کی روشنی پہنچ سکتی ہے۔ اس لئے بھی انسان کو تحریر کی سخت ضرورت ہے۔ اگر انسان کا حافظہ اور یاد ہی کامل کفالت کرتی اور اس بار کی متحمل ہوتی اور امانت کا پورا پورا حق ادا کرتی تو پھر بھی تحریر کی اس لئے ضرورت پڑتی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو خط تحریر کی موجد یہی ضرورت ہے۔

• اب جب کہ معلوم ہو گیا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ پر یہ امر نہایت ضروری اور ان کا پہلا فرض یہی تھا کہ وہ قرآن کی حفاظت کریں اور چونکہ بلا تحریر یقینی اور کامل حفاظت ناممکن ہے۔ اس لئے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور نیز صحابہ پر یہ فرض تھا کہ وہ قرآن کو پورا اس طرح پر لکھواتے جس سے اس کا ہر لفظ اور نقطہ محفوظ ہو جاتا اور نیز جو امور قرآن میں داخل ہیں۔ مثلاً الفاظ یا اعراب کی صحت' آیتوں کی ترتیب، سورتوں کی ترتیب

یہ تمام بھی اسی طرح محفوظ ہیں جس طرح اس میں داخل ہیں۔ اب اگر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہد میں تمام قرآن کو کامل اسی ترتیب سے جیسا کہ وہ ہے نہ لکھواتے تو ضرور سمجھا جاتا کہ انہوں نے اپنے کام میں تقصیر کی اور چونکہ آپ خاتم الانبیاء ہیں روزِ قیامت تک آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں اور آپ کی رسالت عامہ ہے اور تمام کے لئے ہے۔ خواہ وہ آپ کے عہد میں ہوں خواہ بعد میں ہوں۔ قیامت تک جو ہوں گے ان تمام کیلئے آپ کی نبوت ہے۔ قرآن میں ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (سبا، رکوع ۳)

یعنی ہم نے تم کو تمام خلق کے لئے نبی ٹھہرایا۔

اور یہ اسی وقت ہوگا کہ آپ اپنے عہد کے اور نیز تمام ان لوگوں کے لئے جو آپ کے بعد قیامت تک ہوں نبی ہوں ورنہ آپ کے بعد میں کوئی نبی ہو تو پھر اس نبی کے عہد کے لوگوں کے آپ نبی نہ ہوں گے یعنی تمام خلق کے نبی نہ ہوں گے۔ اب ضرور آپ کی تبلیغ بھی عام ہونی چاہیے اور آپ پر فرض ہے کہ قیامت تک کے لوگوں کو آپ تبلیغ کریں اور خدا کا حرف حرف ان تک پہنچا دیں۔ اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ قرآن بعینہٖ اپنے بعد محفوظ چھوڑیں۔ چونکہ قرآن کا تمام و کمال لکھوا کر اپنے میں چھوڑنا بھی تبلیغ کا جزو تھا۔ اس لئے یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ اس کام کو ویسے چھوڑا ہو اور انجام نہ دیا ہو۔ اور اگر یہ خیال کیا جائے کہ قرآن کا لکھوانا واقعی اس کی حفاظت کی بہتر صورت ہے۔ لیکن رسولِ خدا کو اس کا خیال نہ ہوا تو اس کے متعلق یہ کہنا کافی ہے کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی معاملہ فہمی اور دُور اندیشی اور فہم و فراست ایسی نہ تھی جو آپ ایسی موٹی بات کو بھی نہ سمجھتے بلکہ یہ امر مخالفین کو بھی مسلم ہے کہ آپ اعلیٰ درجہ کے فلاسفر اور مصلح اور دُور اندیش تھے۔ اس کے سوا بھی ہم آپ کے عہد کی بہت سی ایسی مثالیں پیش کر سکتے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے ان امور کو لکھوایا جن کی احتیاط اور استحفاظ آپ

کو مقصود تھا۔

(ماخوذ از تاریخ القرآن از علامہ عبداللطیف رحمانی ص ۶۵-۶۲)

قرآن کی ترتیب

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم کی موجودہ ترتیب حضرت عثمان کے عہد میں وجود میں آئی اور حضرت عثمانؓ کو جامع قرآن بھی کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں علامہ عبداللطیف رحمانی صاحب لکھتے ہیں:

"کسی مصنف کی کتاب کی ترتیب کو اگر بدل دیا جائے تو وہ بعد اس تبدّل کے اس مصنف کی کتاب نہیں کہی جاسکتی اور ہر مصنف جس طرح اپنی کتاب کیلئے خاص الفاظ اور مضامین تجویز کرتا ہے۔ اسی طرح اس میں باہم جملوں اور مضامین کا ایک خاص سلسلہ قائم کرتا ہے۔ پس جب کہ خدا تعالیٰ نے اپنے احکام اور خلق کی ہدایت کے لئے ایک کتاب تجویز کی تو اس کتاب کیلئے جس طرح خاص خاص الفاظ تجویز کئے اسی طرح اس کے مضامین اور اس کے حصّوں کا سلسلہ بھی خود ہی قائم کیا۔ اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ اور ترتیب سے خود بھی یاد کیا اور دوسروں کو بھی تعلیم دی اور لکھایا۔ ہمیں ایسے خیال پر نہایت ہی تعجب ہوتا ہے جو سورتوں کی آیتوں کو کہتے ہیں کہ ان کی ترتیب آسمانی نہیں انسانی ہے۔ کیا وہ یہ نہیں سمجھتے قرآن معجز کلام ہے۔ یعنی ایسا کلام ہے جو انسان کی طاقت سے باہر ہے کیونکہ کلام معجز وہی ہے جہاں انسان کی پرواز ممکن نہ ہو اور اس سے بالاتر ہو۔ اب یہ کس طرح ممکن ہے کہ ان آسمانی جملوں کی ترکیب کو کسی انسان کا کام مانا جائے اس لئے کہ جملوں کی ترکیب دینا اور ان میں مناسبت اور مقام کا لحاظ رکھنا ہے تو اعجاز کی روح ہے اور جب یہ ہی کسی انسان کا کام ہوا تو اس کے

بعد اعجاز کے لئے کچھ باقی نہیں رہتا اور ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ ہر سورت میں جس قدر آیتیں اور جملے ہیں ان میں ضرور کوئی ایسا ارتباط ہے جس کی وجہ سے وہ ایک جدا سُورت قرار دی گئی ہے ورنہ اگر ایک سُورت کی تمام آیتوں میں کوئی ایسا مستحکم رشتہ جس نے ان تمام آیتوں کو ایک جگہ منسلک کرلیا ہے نہ ہو تو ایسی صورت میں ان آیات کے مجموعہ کو علیحدہ سورت بنانے کی کوئی وجہ نہ ہوگی اور قرآن میں مختلف سورتیں قرار دینا لغو فعل ہوگا اور ان سورتوں میں بھی یہ فرق کہ ایک سورت ڈھائی پارے کی ہو اور ایک سورت ایک سطر کی بلا کسی ارتباط اور تعلق کے ناممکن ہے تو ضرور ہر سورت کی تمام آیات میں ایک خاص رشتہ ہے اور ہر سورت کیلئے موضوع جُدا جُدا ہے اور غرض و غائت میں بھی فرق ضرور ہے۔ ہاں ہر سورت کے موضوع کو سمجھنا ہی البتہ مشکل ہے۔ تاوقتیکہ موضوع ہر سورت کا معلوم نہ ہو۔ اس وقت تک ان آیات میں ارتباط کا معلوم کرنا ناممکن ہے اور اسی اشکال کی وجہ سے بعض علماء اسلام نے تو صاف یہ اقرار کیا ہے کہ آیات میں باہم ہر جگہ ارتباط اور تعلق نہیں ہے اور ایک دوسرے سے جدا ہیں اور بعض نے ارتباط کو تسلیم کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ باہم تمام آیات اور سورۃ مرتبط ہیں لیکن جو ربط وہ بیان کرتے ہیں اس میں اس قدر تکلف کرنا پڑتا ہے اور آسمان و زمین کے قلابے ملانے ہوتے ہیں کہ یہ ربط خود بے ربطی کے لئے کافی ضمانت ہے۔ اور یہ تکلف یا بے ربطی محض اس وجہ سے ہے کہ سورت کے موضوع اور مبحث کی پہلے تعیین نہیں کی گئی اور وہ نہیں معلوم کیا گیا۔ ہاں موضوع معلوم ہونے کے بعد تمام آیات میں رشتہ اتحاد مستحکم نظر آئے گا اور اس میں کسی تکلف کی ضرورت نہ ہوگی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ایک موضوع کے احکامات، انتخاب اور ان احکام کے بیان میں ترتیب اور ان کی مناسبت ہر شخص کی قابلیت کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک ہی موضوع پر مختلف لوگوں کے بیان میں نمایاں امتیاز اور فرق اور دلوں پر اس

کا اثر جُدا جُدا ہوتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایک موضوع کے احکام اور لواحقات میں آسمانی ترتیب کا مقابلہ کوئی انسانی ترتیب نہیں کر سکتی اور اس کے جذب اور اثر اور گرویدہ کرنے کا جو افسوں اور تسخیر آسمانی ترتیب میں ہوگا وہ کسی دوسرے کی ترتیب میں ناممکن ہے

(تاریخ القرآن از علامہ عبد اللطیف رحمانی صہ ۷۹ - ۷۸)

ولیم میور صاحب "لائف آف محمد" ج ۱ صہ ۵ مطبوعہ لندن ۱۸۶۱ء میں لکھتے ہیں:-

" اور عرب کا حافظہ کیسا ہی ذیر پاکیوں نہ ہوتا ہم ان تحریروں کو جو صرف یاد ہی سے لکھی جائیں، ہم بے اعتبار سمجھ لیتے لیکن اس امر کے باور کرنے کی وجہ معقول ہے کہ بہت سی مجری نقلیں جن میں کل قرآن شامل تھا یا جو تقریباً کُل پر محتوی تھیں۔ مسلمانوں نے پیغمبر کی حیات میں لکھ لی تھیں۔ جب کہ ان لوگوں کو لکھنے کی استعداد حاصل تھی تو صحیح نتیجہ نکل سکتا ہے کہ جو چیز ایسی حفاظتِ شدیدہ سے یاد کی جاتی ہے وہ اس طرح بکمالِ احتیاط لکھی بھی جاتی ہوگی (تاریخ محمدی مولفہ مولوی فیروز الدین) اور اس کے بعد پھر آنریبل فاضل موصوف لکھتے ہیں۔ علاوہ ان تصریحات کے جو قرآن ہی میں خود اس کے مکتوب ہونے پر پائی جاتی ہیں۔ ایک صحیح روایت میں جس میں عمر کے مسلمان ہونے کی کیفیت مروی ہے۔ قرآن کی بیسویں سورۃ کی نقل کا تذکرہ ہے جو عمر کی بہن کے گھر میں ان کے ذاتی مصرف کیلئے تھی۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جو ہجرت سے تین یا چار برس پیشتر گذرا۔ تو اگر اس قدر قدیم زمانے میں قرآن کی نقلیں لکھی جاتی تھیں اور عام تھیں درآنحالیکہ مسلمان کم اور مظلوم تھے تو یقینی نتیجہ نکلتا ہے کہ جب پیغمبر کی موت ہوئی اور یہ کتاب اکثر ملک عرب کے لئے شریعت قرار پائی تو اس وقت قرآن کے نسخے کثرت سے بڑھ گئے ہوں گے۔

فاضل محمد ابن اسحٰق شیعی لکھتے ہیں:-

• ہر کسے کہ تتبع اخبار و تفحص تواریخ و آثار نمودہ بعلم الیقینی میداند کہ قرآن در غایتِ اعلیٰ درجہ تواتر بودہ و آلاف صحابہ حفظ و نقل می کردند آں در عہدِ رسول خدا مجموع مؤلف بود"

• ان کے سوا بھی اگر یہ خیال کیا جائے کہ علمائے اسلام نے جبکہ قرآن کے سوا آنحضرت کی حدیث میں بھی یہ احتیاط کی ہے کہ کوئی قرآن و حدیث کی تعلیم اس وقت تک نہیں دے سکتا۔ جب تک وہ قرآن اور حدیث کسی ایسے عالم و فاضل کو سنا کر سند حاصل نہ کرے جس نے اپنے استاد سے سند حاصل کی ہو۔ اس طرح سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس زنجیر کی آخری کڑی ملتی ہو۔ اور جو شخص بلا اس زنجیر کی کڑی کی گرفت کے محض اپنی علمی قابلیت کے اعتماد پر تعلیم دینا چاہے تو ہرگز کوئی مسلمان اس کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہ کرے گا تاوقتیکہ وہ اپنے قرآن اور حدیث کے سماع کو معتبر شخص سے ثابت نہ کرے اور اس میں اور آنحضرتؐ میں جو واسطے ہیں ان کی پرہیزگاری اور دینداری ثابت نہ ہو اسلامی دنیا میں اس وقت جس قدر حفاظ اور قرآن کے قاری ہیں وہ تمام اسی قرآن کی سماعت کو مختلف واسطوں سے آنحضرتؐ تک پہنچاتے ہیں اور ہر ایک قاری اور حافظ کی سند کا آخری شخص اسی قرآن مرتب کی بلا تغیر و تبدل اور کمی بیشی کے اپنی سماعت آنحضرت سے بیان کرتا ہے۔ تو اب جب یہی قرآن اس سلسلہ سے ہمارے حفاظ اور قرار تک پہنچا ہے۔ اور تمام حفاظ اور قاری اسی قرآن کی سند کو بعینہٖ اسی ترتیب اور الفاظ سے آنحضرتؐ تک پہنچاتے ہیں اور ہر ایک کی سند کا منتہیٰ آنحضرت پر ہے اور مصحف لکھے ہوئے پر اعتماد نہیں کیا گیا اور یہ سلسلے اور سندیں جو آنحضرت تک پہنچتے ہیں اس کثرت سے ہیں جو تواتر کی حدود سے بہت زیادہ آگے بڑھ جاتے ہیں تو تنہا تمام حفاظ اور قرار کا اسی قرآن مرتب کو آنحضرت سے روایت کرنا اس امر کے لئے کافی شہادت ہے کہ یہ ترتیب سرورِ کائنات کی دی ہوئی ہے اور اب اس فیصلہ اور یقین کیلئے اس کے سامنے کسی خارجی شہادت

کی احتیاج نہیں ۔ اور تنہا یہی دوسری دلیلوں سے بے نیاز اور مستغنی بنا دیتی ہے۔ پس جب اس دلیل سے یہ ثابت ہوا کہ یہ قرآن وہی ہے جو آنحضرت نے اپنے بعد چھوڑا۔ اور اپنی امت کو تعلیم کیا اور جس ترتیب اور طریقہ سے آپ نے تعلیم کیا وہ بلا کسی تغیر کے بعینہٖ ویسی ہی موجود ہے اور اس موجودہ قرآن کی ترتیب بلاشبہ انوارِ نبوت کی روشنی میں انجام کو پہنچی ہے۔ پس علم اور یقین کی یہ عمارت جو تواتر کے بلند پہاڑ کی مضبوط چٹان پر قائم ہو۔ اس سے وہ آبگینہ جس کا خمیر خبرِ آحاد سے ہو اگر ٹکرائے تو بجز اس کے کہ خود پاش پاش ہو جائے۔ اس مضبوط عمارت کو صدمہ نہیں پہنچ سکتا۔ تواتر کی روشنی ایسی صاف اور لطیف اور تیز ہے جس کے روبرو خبرِ احاد کی ٹمٹماتی روشنی ماند ہو جاتی ہے اور آفتابِ قلوب تاب کے طلوع ہوتے ہی خبرِ احاد کے کواکب تاریکی کی چادر میں پوشیدہ اور تمام کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور بے نیازی کی وجہ سے کسی کی اس پر نظر نہیں پڑتی بلکہ کسی شہادت اور خبر کا تواتر کے خلاف ہونا ہی اس کے کمزور اور بے وقعت ہونے پر نہایت ہی معتبر تمسک ہے جیسا کہ اصولِ فقہ میں ہے۔

" اب بہت سے واقعات بے اختیار ہمیں اس پر مائل کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے اپنے عہد میں قرآن کو مرتب کیا اور تعلیم دیا۔ بہت سے صحابہ نے آپ سے پورا لکھا اور نیز اس قدر اخبار کی اس پر شہادت ہے جو متواتر سے بھی زیادہ ہیں اور پھر قرآن کے حفاظ اور قراء کی وہ سندیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہیں اور درجہ تواتر پر ہیں ۔ ان تینوں باتوں سے اگرچہ ہر ایک تنہا ہمارے دعوے پر کافی روشنی ڈالتا ہے مگر بعد ان تینوں باتوں (یعنی واقعات، اخبار، سندات) کے ہمارا یہ دعویٰ کہ قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مرتب تھا جو ترتیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دی اسی ترتیب سے لکھے ہوئے تھے اور بہت سے اس کے پورے حفاظ آپ کے عہد میں موجود تھے ۔ ایسا روشن اور مستحکم ہو جاتا ہے کہ اس کے سامنے شکوک اور شبہات

کی تاریکی کا پردہ خود بخود اٹھ جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کی دریافت اور سمجھنے کے آلات ایسے ضعیف ہوں کہ اس روشنی کی تاب سے ان کی خیرگی اور بڑھ جائے یا ان میں یہ آلات ہی نہ ہوں یا کسی اندرونی تاریکی اور عناد نے ان کے حواس کو معطل کردیا ہو۔

(ماخوذ از تاریخ القرآن از علامہ عبداللطیف رحمانی صہ ۹۳-۹۱)

شانِ نزول

قرآنِ کریم کی محکمیت کو متزلزل کرنے کے بعد بھی یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کتابی شکل میں مرتب و مدوّن کرا کے امت کو دیا ہی نہ تھا۔ دوسرا وار جو قرآنِ کریم پر عجمی سازش نے کیا وہ یہ تھا کہ آیاتِ قرآنی کے ساتھ واقعات منسوب کر دیئے اور اس کو شانِ نزول کا نام دے کر قرآنی تفاسیر میں بھر دیا اور کہا کہ فلاں واقعہ پیش آیا تو فلاں آیت کا نزول ہوا جس سے یہ تأثر پیدا کرنا تھا کہ اگر یہ واقعات رُونما نہ ہوتے تو شاید ان آیات کا نزول نہ ہوتا۔ اور پھر ان کے پسِ پردہ جو واقعات اور حکایات گھڑی گئیں ان کا مقصد بھی انبیاء علیہم السلام، امّ المسلمین ازواجِ مطہرات اور صحابہ کبار رض کی سیرت و کردار کو مسخ کرنا مقصود تھا چونکہ قرآنی تعلیمات کے برخلاف اسلاف پرستی کو مقدس بنا دیا گیا، اسلئے متقدمین و متاخرین اس کو مقدس فریضہ سمجھتے ہوئے اپنی قرآنی تفاسیر میں نقل در نقل کرتے چلے گئے اور آج یہ ہمارے ایمان کا حصہ بن چکا ہے۔ اب ہماری اکثر و بیشتر قرآنی تفاسیر اور اسلامی لٹریچر

شانِ نزول کے قصوں سے بھرا پڑا ہے۔

شانِ نزول کے تباہ کن تصوّر کو شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" میں بہت ہی حکیمانہ موقف اختیار کر کے رد کیا ہے۔ مگر وہ علماء حضرات بھی جو ان کو حجت اور سند مانتے ہیں ان کے اس موقف کو ماننا تو درکنار اس کا اشارہ کرنے کے بھی روادار نہیں اور جو کوئی بھی شاہ صاحب کے اس موقف کی تائید کرے اسے یہ علماء حضرات فاسق فاجر قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ شانِ نزول کے عقیدہ کے انکار سے اکثر و بیشتر قرآنی تفاسیر اور اسلامی لٹریچر کا بڑا حصہ بے وقعت ہو کر رہ جاتا ہے۔ شانِ نزول کا یہ تباہ کن تصوّر کہاں تک بگاڑ پیدا کرتا ہے۔ اس کا تو آئندہ صفحات میں جائزہ پیش کیا جائے گا۔ سرِدست شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ کا شانِ نزول کے متعلق موقف پیشِ خدمت ہے۔

آپ لکھتے ہیں:-

• علم التفسیر کا دوسرا دشوار ترین مسئلہ معرفتِ اسبابِ نزول ہے۔ اس میں بھی بعض اشکال وہی متقدمین اور متاخرین کی اصطلاحات کا اختلاف ہے۔ کلام حضراتِ صحابہ اور تابعین رضوان اللہ علیہم کے استقرار سے جس قدر ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کا یہ کہنا نزلت فی کذا (یہ آیت فلاں بارہ میں نازل ہوئی) کسی ایسے قصّے کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتا جو زمانۂ نبویؐ میں واقع ہو کر نزولِ آیت کا سبب ہوا۔

" ان کی عادت ہے کہ مصداقہائے آیت میں سے کسی ایسے مصداق کو جس کا وجود زمانۂ نبوی اور یا اس کے بعد ہوا ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم کسی آیت سے استنباط فرمایا اور اس آیت کو اس موقعہ پر تلاوت کیا ہو تو ایسے واقعات کو بھی بیان کرتے ہوئے وہ کہہ دیا کرتے ہیں، نزلت

فی کذا۔ ایسی خاص صورتوں میں کبھی فانزل اللہ تعالیٰ قولہ کذا یا فنزلت بھی استعمال کرتے ہیں ان کا یہ کہنا اس بات کا اشارہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی آیت سے استنباط اور آپ کے قلب مبارک میں اس وقت اس آیت کا القا بھی وحی اور نفث فی الروع کی ایک قسم ہے یہی وجہ ہے جو اس موقع پر لفظ فانزلت کا استعمال جائز ہے۔ اگر کوئی شخص تکرار نزول کے ساتھ اس کو تعبیر کرے یہ بھی ممکن ہے۔

" محدثین آیاتِ قرآنی کے ذیل میں ایسی بہت اشیاء ذکر کر جاتے ہیں جو فی الحقیقت اسبابِ نزول میں داخل نہیں ہوتیں۔ مثلاً صحابہ کا اپنے باہمی مناظرات میں کسی آیت سے استشہاد کرنا یا آیت سے تمثیل دینا یا اپنے کلام کے استشہاد میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی آیت کو تلاوت فرمانا اور یا محدثین کا کسی ایسی حدیث کا روایت کرنا جس کو آیت کے ساتھ اس کی اصل غرض یا موقع نزول یا اسماء مذکورہ فی الآیت کے مبہم کی تعین میں موافقت حاصل ہو۔ یا کسی کلمہ قرآنی کے لئے ادائے لفظ کا طریقہ یا سورتوں اور آیات کے فضائل یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے امتثالِ امرِ قرآنی وغیرہ کی صحیح تصویر۔ درحقیقت یہ تمام باتیں اسبابِ نزول میں شمار نہیں ہیں اور نہ ان کا احاطہ کرنا مفسر کی شرائط میں داخل ہے۔ مفسر بننے کے لئے دو چیزوں کی معرفت شرط ہے۔ ایک وہ واقعات جن کی طرف آیات مشیر ہوں۔ کیونکہ ایسی آیات کے ایماء کا سمجھنا بغیر علم واقعات کے میسر نہیں آسکتا اور دوسرے وہ قصے جس سے عام کی تخصیص یا اور کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہو۔ مثلاً آیت کو اس کے ظاہری معنی سے پھیرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ آیات کے اصل مقصد کا علم ان قصص کی موافقت کے بدون ممکن نہیں۔

" یہاں پر یہ جان لینا مناسب ہے کہ حضرات انبیاء سابقین کے قصے احادیث

میں کم مذکور ہیں اور ان کے وہ لمبے چوڑے تذکرے جن کے بیان کرنے کی تکلیف عام مفسرین برداشت کرتے ہیں وہ سب الا ماشاء اللہ علماء اہل کتاب سے منقول ہیں۔ صحیح بخاری میں مرفوعاً مروی ہے۔ لا تصدقوا اہل الکتاب ولا تکذبوہم (تم اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب کرو) اور یہی جان لینا چاہیئے کہ حضرات صحابہ اور تابعین مشرکین و یہود کے مذاہب اور ان کی جاہلانہ عادات کے بارہ میں قصہائے مخصوصہ اس لئے بیان فرماتے ہیں کہ وہ عقائد و عادات زیادہ روشن ہو جائیں اور ایسے موقع پر وہ اکثر کہہ دیتے ہیں نزلت الایۃ فی کذا اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ فلاں آیت اس طرح کی واقعات کی نسبت نازل ہوئی ان کی مراد اس سے عام ہوتی ہے کہ سبب نزول وہی واقعہ ہو یا اس کے مانند اور کوئی۔ اور یا آیت اس کے قریب نازل ہوئی ہو۔ اس صورتِ خاص کے اظہار سے ان کا مقصد اس کی تخصیص کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ فقط یہ غرض ہوتی ہے کہ یہ صورت ان امورِ کلیہ کے لیے (جن کا اظہار و بیان ضروری ہے) ایک اچھی تصویر ہے۔ اس لیے بسا اوقات ان کے اقوال باہم مختلف اور اپنی اپنی طرف کھینچتے ہوئے نظر آتی ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں سب کا مطلب ایک ہی ہوتا ہے۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے جس مقام پر یہ کہا ہے کہ کوئی شخص ہرگز فقیہ نہیں ہو سکتا جب تک اس میں ایک آیت کو متعدد معانی پر عمل کرنے کا ملکہ نہ پیدا ہو جائے وہاں اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(شاہ ولی اللہ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر صہ ۴۰ - ۳۸)

مندرجہ بالا بیان کے مطابق شاہ ولی اللہ علیہ الرحمتہ نے فرمایا ہے کہ متقدمین کے ہاں شانِ نزول کا لفظ تو ہمیں ملتا ہے لیکن ان کے ہاں وہ تصور ناپید ہے جو آج ہمارے ہاں پایا جاتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں شانِ نزول کا مفہوم یہ ہے کہ فلاں اور فلاں واقعہ فلاں سورت یا فلاں آیت کا سبب نزول بنا

ایسا سمجھنا غلط ہے ۔ ہاں متقدمین کے ہاں شانِ نزول کا بس اتنا سا مفہوم تھا کہ ایسے ایسے حالات یا واقعات میں فلاں فلاں واقعات سُورت یا آیت کا اطلاق ہوسکتا ہے یعنی فلاں فلاں واقعات یا اسباب کو دور کرنے کیلئے یا فلاں فلاں خرابیوں کی اصلاح کرنے کیلئے فلاں فلاں سورت یا آیت سے یہ اور یہ ہدایت و راہنمائی حاصل ہوتی ہے اور بس۔

دلچسپ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ علماء حضرات جو شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کو سب سے بڑا علامہ اور سب سے بڑی حجت مانتے ہیں اور اپنی علمی اسناد کا ربط و تعلق ان سے اور ان کی آل اولاد سے قائم کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں وہ بھی نہ صرف یہ کہ شاہ صاحب کے اس حکیمانہ مُوقف کو کوئی اہمیت نہیں دیتے بلکہ اس کا اشارہ کرنے کے بھی روادار نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر شاہ صاحب کے مُوقف کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر ان علماء حضرات کی قرآنی تفاسیر کی ضخیم جلدوں اور دوسرے اسلامی لٹریچر کا معاملہ نازک صورت اختیار کر جاتا ہے اور یہ بے وقعت ہو کر رہ جاتا ہے اور ان حضرات کی علمیت و عقلیت کا پول کھل جاتا ہے ۔ ان حضرات کی قرآنی تفاسیر چونکہ شانِ نزول کے قِصص سے بھری پڑی ہیں۔ اس لئے جو بھی مفسر و مفکر شاہ صاحب کے مُوقف کی تائید کرتا ہے یہ اس کو فاسق و فاجر قرار دینے میں پورے پھیپھڑوں کا زور لگا دیتے ہیں۔

اب ذرا ایک قدم اور آگے بڑھیئے اور قرآن کی ان آیات کی تفصیل دیکھیئے جو صحابہ کرام کی زبان سے بات نکلی اور اللہ تعالیٰ نے اس کے مطابق آیت نازل کر دی اس سلسلے میں علامہ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں :-

قرآن کے ان حصّوں کا بیان جو بعض صحابہ کی زبان میں نازل ہوئے

" یہ دَر اصل اسباب نزول ہی کی ایک نوع ہے اور اس کی اصل عمرؓ کے موافقات ہیں یعنی وہ باتیں جو انہوں نے کہیں اور پھر انہی کے مطابق قرآن کا نزول ہوگیا۔ ایک گروہ نے اس عنوان پر مستقل کتابیں بھی لکھ ڈالی ہیں۔ مگر میں الاختصار ان کو یہاں درج کردوں گا۔

" ترمذی ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " اِنَّ اللّٰہَ جَعَلَ الْحَقَّ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ وَ قَلْبِہٖ بے شک خدا نے عمرؓ کی زبان اور ان کے دل کو حق کا مرکز بنایا ہے۔ ابن عمر کہتے ہیں کسی معاملہ آپڑنے کی حالت میں جب کہ دیگر لوگوں نے بھی اس پر رائے زنی کی ہو اور عمرؓ نے بھی اس کی بابت کچھ کہا ہو۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ قرآن کا نزول عمرؓ کے کہنے کے خیال میں کوئی بات آتی تھی تو قرآن بھی اس کے موافق ہی نازل ہوتا تھا۔ بخاری وغیرہ نے انسؓ سے روایت کی ہے کہ انسؓ نے کہا عمرؓ کہتے تھے کہ میں نے تین باتوں میں اپنے پروردگار سے موافقت کی ہے (۱) میں نے کہا یارسول اللہ اگر ہم مقام ابراہیم کو مصلےٰ بنالیتے (تو اچھا ہوتا) اور اسی وقت آیت کریمہ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰھِیْمَ مُصَلًّی نازل ہوئی (۲) میں نے کہا یارسول اللہ آپ کی بیویوں کے سامنے نیک اور بد ہر طرح کے لوگ چلے جاتے ہیں اس لیے اگر آپ ان کو پردہ کرنے کا حکم دیتے تو بہتر ہوتا پس آیت حجاب نازل ہوئی (۳) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام بیویاں آپ کی بابت غیرت رکھنے میں ایک سی ہوگئیں تو میں نے ان سے کہا " عَسٰی رَبُّہٗٓ اِنْ طَلَّقَکُنَّ اَنْ یُّبْدِلَہٗٓ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْکُنَّ " (یعنی اگر رسول اللہ صلعم تم کو چھوڑ دیں گے تو امید ہے کہ ان کا خدا انہیں تمہارے بدلے میں تم سے اچھی بیویاں دے گا) اور اسی طرح پر قرآن کا بھی نزول ہوا اور مسلم نے بواسطۂ ابن عمر خود عمرؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا میں

نے اپنے پروردگار کے ساتھ تین باتوں میں موافقت کی ہے۔ حجاب۔ قیدیان بدر اور مقامِ ابراہیم کے بارہ میں اور ابنِ ابی حاتم نے انس سے روایت کی ہے انہوں نے بیان کیا کہ عمرؓ نے کہا۔ میں نے اپنے پروردگار کی یا میرے پروردگار نے میری چار باتوں میں موافقت کی ہے۔ یہ آیت نازل ہوئی "وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ"۔ الایۃ اور جب یہ نازل ہوئی تو میں نے کہا "فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ" پھر خدا کی طرف سے بھی نازل ہوا فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ اور عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے روایت کی گئی ہے کہ ایک یہودی عمر ابن الخطاب کو ملا اور اس نے کہا بے شک جبرئیل جس کا ذکر تمہارا دوست کرتا ہے وہ ہمارا دشمن ہے۔ عمرؓ نے اسکو جواب دیا۔ مَن كَانَ عَدُوًّا لِّلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِينَ۔ یعنی جو شخص خدا کا اور اس کے فرشتوں اور رسولوں کا اور جبرئیل و میکال کا دشمن ہے تو اس میں شک نہیں کہ اللہ کافروں کا دشمن ہے۔ عبدالرحمٰن کہتا ہے پس یہ آیت عمرؓ کی زبان پر نازل ہوئی یعنی بالکل انہی کے کہنے کے مطابق خدا نے بھی فرمایا ہے۔

اور سنید نے اپنی تفسیر میں سعید بن جبیر سے روایت کی ہے کہ معاذ نے جس وقت وہ بری بات سنی جو بی بی عائشہ کی شان میں کہی گئی تھی تو انہوں نے کہا سُبْحَانَكَ هَٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ پھر اسی طرح یہ آیت نازل ہوئی اور ابن اخی میمی نے اپنی کتاب فوائد میں سعید بن المسیب سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا نبی صلعم کے اصحاب میں سے دو شخص ایسے تھے کہ جب وہ اس قسم کی کوئی بات سنتے تو کہتے "سُبْحَانَكَ هَٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ" زید بن حارثہ اور ابو ایوب تھے پھر یہ آیت اسی طرح نازل ہوئی۔

"ابن ابی حاتم نے عکرمہ سے روایت کی ہے کہ جس وقت معرکہ احد کی خبر عورتوں

کو ملنے میں دیر ہوئی تو وہ شہر مدینہ سے دریافتِ حال کے لیے باہر نکلیں۔ اسی وقت ناگہاں دو آدمی ایک اونٹ پر سوار میدانِ جنگ کی طرف سے شہر آرہے تھے۔ کسی عورت نے ان سے دریافت کیا "رسول اللہ صلعم کیسے ہیں؟" شتر سواروں میں سے ایک شخص نے جواب دیا "وہ زندہ ہیں" عورت یہ مژدہ سن کر یہ کہنے لگی "پھر میں اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتی کہ خداوندِ کریم اپنے بندوں میں سے جن کو چاہے شہادت کا رتبہ عطا کرے" فَلَا أُبَالِي يَتَّخِذُ اللّٰهُ مِنْ عِبَادِهِ الشُّهَدَاءَ۔ پھر قرآن بھی اسی کے کہنے کے مطابق نازل ہوا " وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ "

(الاتقان فی علوم القرآن از علامہ جلال الدین سیوطی صہ ۹۰ ۸۰)

مندرجہ بالا اقتباسات سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ شانِ نزول کے عقیدہ نے بات کہاں سے کہاں تک پہنچا دی۔ اس سلسلے میں علامہ اسلم جیراجپوری کا تبصرہ پیشِ خدمت ہے آپ لکھتے ہیں:

"قرآن اللہ کا کلام ہے۔ وہ کسی ایک ماحول ایک زبان ایک مکان کیلئے نہیں ہے بلکہ ہر ماحول ہر زبان اور ہر مکان میں انسان کا اشیائے فطرت کے متعلق جس قدر علم بڑھتا جائے گا۔ اسی قدر قرآنی حقائق بھی اس کی سمجھ میں آتے جائیں گے اور قرآن بھی فطری اشیاء کی طرح کسی زمانہ میں ختم ہو جانے والا اور تھکنے والا نہیں ہے بخلاف انسانی اقوال کے کہ ان کے معانی محدود ہوتے ہیں

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عہدِ صحابہ میں قرآن بالکل سمجھ لیا گیا اور اب ہم کو انہی کی فہم پر قناعت کرنا چاہیئے۔ وہ قرآن کی حقیقت سے آشنا نہیں ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا علمِ قرآن دیگر علماء سے قرآن سے اس لحاظ سے افضل ہے کہ انہوں نے اس کے عملی پہلو کو اختیار کیا اور جو کچھ سمجھایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے ان کو سمجھایا۔ اس کی حرف بحرف تعمیل کی اور حقیقت یہ ہے کہ قرآن صرف نظری کتاب نہیں ہے۔ بلکہ عملی بھی ہے اور اس کی ہدایات پر عمل کرنے سے ہی فلاح نصیب ہوتی ہے۔ اس لیے صحابہؓ کا درجہ عملی لحاظ سے اس قدر افضل ہے کہ ساری امت مل کر بھی ان کے رتبہ کو نہیں پہنچ سکتی۔ لیکن جو لوگ فہم قرآن کو ان روایات میں الجھانا چاہتے ہیں جو صحابہ کرام سے مروی ہیں وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ قرآن کسی ایک ماحول کی کتاب نہیں ہے۔ اگر کسی زمانہ میں وہ بالکل سمجھ لیا گیا تو بس بالکل ختم ہو گیا اور آئندہ کے لئے نصاب نہیں رہا۔ لیکن وہ قیامت تک کے لیئے نصاب ہے اور ہر زمانہ میں نئی روشنی ہدائت کے لیے اس سے نکالی جاسکتی ہے۔ علاوہ بریں یہ روایات جن ذرائع سے آئی ہیں وہ اس غیر یقینی اور مشتبہ ہیں کہ ان پر قرآن جیسی قطعی اور یقینی چیز کا مدار رکھنا اس کی قطعیت کو کھونا ہے۔

یہ خیال بھی کہ اس زمانہ میں جب آیات نازل ہوئی تھیں لوگ ان کے شانِ نزول سے واقف تھے اس لئے انہوں نے اچھی طرح ان کو سمجھ لیا۔ دراصل قرآن کے متعلق اسی غلط تصور کا نتیجہ ہے کہ وہ ایک ہی زمانہ کی چیز ہے۔ قرآن کسی شانِ نزول، موقع نزول یا واقع نزول کا پابند نہیں ہے اور اس کی ہدایات مخصوص زمان و مکان سے وابستہ نہیں ہیں بلکہ بالاتر ہیں۔

مقالہ علامہ اسلم جیراجپوری۔ شائع کردہ ادارہ تبلیغ القرآن لاہور، صہ ۶، ۷

کیا معوذتین قرآن کا حصہ تھیں یا نہیں؟

اب ذرا اور آگے بڑھیئے اور دیکھئے کہ قرآنِ کریم کو مشتبہ کرنے کے لیئے تحقیق کے نام پر ہمارے سلف دانشوروں نے کیا کیا بحثیں چھیڑیں ان

مباحث سے سوائے اس کے کہ قرآن کریم کو مشتبہ بنا کر اس کی مملکت کو متزلزل کیا جائے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ملاحظہ فرمائیے تفسیر ابنِ کثیر۔

"مسند احمد میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اس سورت کو اور اس کے بعد کی سورت کو قرآن شریف میں نہیں لکھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ میری گواہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے خبر دی کہ جبریل (علیہ السلام) نے آپؐ سے فرمایا قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ا تو مَیں نے بھی یہی کہا۔ پھر فرمایا قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ تو مَیں نے یہی کہا۔ تو ہم بھی اسی طرح کہتے ہیں جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا۔ حضرت ابیّ ابنِ کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سے ان دونوں سورتوں کے بارے میں پوچھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ آپ کے بھائی حضرت ابنِ مسعودؓ تو ان دونوں کو قرآن شریف میں سے کاٹ دیا کرتے تھے۔ تو فرمایا کہ مَیں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا مجھ سے کہا گیا کہو، مَیں نے کہا پس ہم بھی کہتے ہیں جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا (ابوبکر حمیدی) مسند میں بھی یہ روایت الفاظ کے ہیر پھیر کے ساتھ مروی ہے۔ اور بخاری شریف میں بھی۔ مسند ابو یعلیٰ وغیرہ میں ہے کہ ابنِ مسعود اِن دونوں سورتوں کو قرآن شریف میں نہیں لکھتے تھے اور نہ قرآن میں انہیں شمار کرتے تھے۔ بلکہ قاریوں اور فقیہوں کے نزدیک مشہور بات یہی ہے کہ حضرت ابن مسعودرضؓ ان دونوں سورتوں کو قرآن شریف میں نہیں لکھتے تھے۔ شاید انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنا ہو اور تواتر کے ساتھ ان تک نہ پہنچا ہو۔ پھر یہ اپنے اس قول سے رجوع کر کے جماعت کے قول کی طرف پلٹ آتے ہیں۔ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے ان سورتوں کو آئمہ کے قرآن

میں داخل کیا جس کے نسخے چو طرف پھیلے۔"

تفسیر ابن کثیر جلد ۵ صفحہ ۶۱۹-۶۱۸ شائع کردہ کارخانہ کتب آرام باغ لاہور

معذتین سے متعلق مندرجہ بالا بحث عقیدہ شانِ نزول کی تباہ کاری کی نشاندہی کرنے کیلئے پیش کی گئی ہے۔ معذتین کا شانِ نزول جو قرآنی تفاسیر میں اکثر وبیشتر بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر دو یہودی لڑکیوں نے جادو کر دیا تھا۔ جس کے زیرِ اثر کافی عرصہ آپ ذہنی اور جسمانی طور پر پریشانی میں مبتلا رہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے نجات دلانے کیلئے دونوں سورتیں نازل کیں تاکہ ان کو پڑھنے سے صحتیابی حاصل ہو سکے اور یہ دونوں سورتیں چونکہ وقتی اور ہنگامی طور پر ایک خاص مقصد کے لیے نازل کی گئی تھیں لہٰذا یہ متنِ قرآن کا مستقل حصہ نہ تھیں (معاذ اللہ) اس لیے ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ ان دونوں سورتوں کو قرآن میں نہ لکھا کرتے تھے۔ بلکہ اگر لکھا ہوا پاتے تو کھرچ دیا کرتے تھے مگر بعد میں ان دونوں سورتوں کو متنِ قرآن کا مستقل حصہ تسلیم کر کے داخلِ قرآن کر دیا گیا وغیرہ وغیرہ۔

ذرا سوچیے کہ کیا ایسے مباحث قرآن کریم کی محکمیت کو متزلزل کرنے اور اس کے وقار کو ٹھیس پہنچانے کی ناپاک کوششیں نہیں ہیں؟ جو تحقیق کے نام پر کی گئیں۔

اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے کہ فلاں فلاں واقعات چونکہ رُونما ہوئے اس لئے فلاں فلاں آیات کا نزول ہوا۔ تو واقعات تو رُونما ہوتے رہیں گے۔ مگر وحی کا سلسلہ تو چودہ سو برس پیشتر ختم ہو گیا تو کیا یہ نتیجہ اخذ کر لیا جائے کہ قرآن کریم (معاذ اللہ) ادھورا رہ گیا؟ یا اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور تئیس سال زندہ رہتے تو شائد قرآن کریم کی ضخامت موجودہ متنِ قرآن سے دوگنا ہوتی (معاذ اللہ)

کیا احادیث وحیٔ خفی ہیں؟

گذشتہ صفحات میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ قرآن کریم کی محکمیت کو متزلزل کرنے اور اس میں اشکال پیدا کرنے کی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی گئی ہے اور یہ سب احادیث و روایات کے ذریعے سے ہی کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ احادیث کے مقام کے متعلق کچھ گفتگو کی جائے۔ احادیث کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ اقوال رسولؐ کے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال بھی وحی ہیں جن کو وحیٔ خفی یا وحیٔ غیر متلو بھی کہا جاتا ہے۔

رشد و ہدایت کا سلسلہ بنی نوع انسان کے لئے پہلے دن سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ اس رشد و ہدایت کو لانے والے انسان ہی ہوا کرتے تھے۔ وہ کبھی مافوق البشر نہیں ہوئے نہ انہوں نے مافوق البشر ہونے کا کبھی دعویٰ کیا بلکہ انہوں نے نہایت صفائی کے ساتھ اس کا اعلان کیا کہ ہم بشر ہیں اور صرف بشر ہیں۔ لیکن انسان کی اعجوبہ پسندی نے کبھی بھی یہ باور نہیں کیا کہ ایک رسول اور نبی بھی انسان ہو سکتا ہے۔ اس کی سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آسکی کہ اس منصب جلیل پر فائز شخصیت بشر بھی ہو سکتی ہے۔

سورہ انبیاء میں ہے۔

هَلْ هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يريد ان يتفضل عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۚ مَا سَمِعْنَا ... اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ (۲۳/۲۴)

یہ تو تم ہی جیسا انسان ہے تم پر برتری حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اللہ کو بھیجنا ہی ہوتا تو فرشتے بھیجتا۔ ہم نے اپنے پچھلے باپ دادوں میں سے یہ بات کبھی نہیں سنی کہ اللہ انسانوں کو بھی رسول بنا کر بھیجتا ہے۔

ایک اور مقام پر ہے:

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ - ۲۳/۳۳

یعنی "یہ تو تم جیسا ہی آدمی ہے جو تم کھاتے ہو وہی یہ کھاتا ہے جو تم پیتے ہو وہی یہ پیتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور مقام پر ہے

مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا فَأْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۱۵۴ (۲۶/۱۵۴)

یعنی "تو تو ہماری طرح کا ایک آدمی ہے (تو کیسے ہو سکتا ہے) اگر تو سچا ہے تو کوئی نشانی لا"

ایک اور مقام پر ہے:

وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ (۱۸۶/ ۲۶)

یعنی "تو تو ہم ہی جیسا انسان ہے۔ ہم تو تجھے بالکل ہی جھوٹا خیال کرتے ہیں"

ایک اور مقام پر ہے

فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا (۶۴/۶)

یعنی تو انہوں نے کہا کیا ہماری راہنمائی ایک انسان کرے گا۔ چنانچہ انہوں نے انکار کر دیا اور منہ موڑ لیا۔

ایک اور مقام پر ہے:

وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (۲۳/۳۴)

یعنی "اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک انسان کی اطاعت کر لی تو تم نے اپنا ستیاناس کر لیا۔"

اس طرح قرآنِ کریم نے دیگر متعدد مقامات پر اس انسانی ذہنیت کی عجوبہ پسندی کو ظاہر کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو باتیں بشری حیثیت میں کیں یا جو فیصلے بشری حیثیت میں کئے ان کو بھی اہلِ حدیث حضرات نے عجوبہ پسندی کے تحت وحی قرار

دے دیا اور اس کو "وحی خفی" سے موسوم کیا۔ اس کے متعلق مفکر قرآن جناب خواجہ احمد الدین امرتسری نے ایک طویل مضمون لکھا۔ جس میں سے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

"روزِ اول سے انسان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ بشر بھی رسالت اور نبوت کے منصب پر فائز ہو سکتا ہے اور اپنے ہی جیسے انسانوں کو رشد و ہدایت عطا کر سکتا ہے۔ قرآن کریم نے چونکہ انبیاء اور رسل کی بشریت پر انتہائی زور دیا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کے لئے یہ تو ممکن نہیں رہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت سے انکار کر دیں۔ کیونکہ آپ کی بشریت کا انکار کرنا قرآن کا انکار کرنا ہوگا۔ جس کے بعد کوئی مسلمان، مسلمان ہی نہیں رہ سکتا۔ لیکن جو عجوبہ پسندی دل کی گہرائیوں میں روزِ اول سے گھر کر چکی ہے۔ چونکہ وہ نکل نہیں سکی۔ اس لئے لوگ آپ کی بشریت میں بھی طرح طرح کے عجائبات پیدا کرنے پہ تلے ہوئے ہیں۔ اسی کا یہ اثر ہے کہ کبھی فرمودات نبوی کو فرمودات الٰہی ثابت کیا جاتا ہے، کبھی آپ کو وحی کے علاوہ بھی معصوم عن الخطا ثابت کیا جاتا ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ اگر بالفرض کبھی آنحضرتؐ سے غلطی ہو بھی جاتی تھی تو فوراً حق تعالیٰ کی طرف سے اس کی اصلاح کر دی جاتی تھی۔ آپ کا کوئی اقدام بلا مرضیٔ الٰہی اور غیبی اشارہ کے نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ کی زبان سے نکلا ہوا کوئی لفظ بغیر وحی کے نہیں ہوتا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایک آدمی کے متعلق یہ کہنا کہ وہ بشر ہے اور رسول ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس میں وہ تمام خصائص تمامہ موجود ہیں جو ایک بشر اور ایک رسول میں ہونے ضروری ہیں۔ چنانچہ ہر ممبر و محراب سے جب کمالاتِ نبوی کا اظہار کیا جاتا ہے تو آپؐ کو انسان کامل ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا جاتا ہے۔ لیکن دوسرے لمحے جب عقیدت مندانہ اعجوبہ پسندی کا دورہ پڑتا ہے تو آپ کو تمام بشری خصوصیات

سے منزہ و مبرّہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی جانے لگتی ہے جو ہماری عقیدتمندی کا ایک تضاد ہے کہ ایک طرف تو آپؐ کو انسانِ کامل بتایا جائے اور دوسری طرف انہیں اتنا عاجز اور ناکارہ ثابت کیا جائے کہ نہ آپ اپنے اختیار و ارادہ کے مالک تھے نہ حریتِ فکر و نظر کے وارث۔ آپ اپنی مرضی سے ایک قدم نہیں اٹھا سکتے تھے اور اپنے ارادہ سے ایک لفظ نہیں بول سکتے تھے۔ آپ بے جان مشین کا ایک بے جان پرزہ تھے کہ اپنے انجینئر کی مرضی کے مطابق حرکت کرنے پر مجبور تھے۔ دو سال کے ایک بچہ کی طرح آپ اس کے محتاج تھے کہ جبریلؑ آپ کی انگلی پکڑ کر چلائیں اور منہ میں اپنے بول ڈالیں۔ آپ کا بس یہ حال تھا ؎

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
انچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم

ہم نے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مجسمہ تراشا ہے جو اپنے کھڑا کرنے والے کی مرضی کے مطابق جہاں اسے کھڑا کر دیا گیا کھڑا ہے۔ اس کی اپنی خواہش کوئی ہے ہی نہیں۔ ہم ایک آدمی سے حرکت کرنے کی قوت سلب کر لیتے ہیں اور خوش ہیں کہ وہ بڑا مطیع و فرمانبردار ہے۔ ذرا حرکت نہیں کر رہا۔ ہم اس کی بصارت سلب کر لیتے ہیں اور خوش ہیں کہ وہ بڑا نیک آدمی ہے۔ ہزاروں حسینائیں سامنے سے گزر جاتی ہیں وہ کسی کو بری نظر سے نہیں دیکھتا۔ ہم اس کی زبان بند کر دیتے ہیں اور نازاں ہیں کہ وہ بڑا صابر ہے کہ کسی کی بدگوئی نہیں کرتا۔ اس کی خواہشاتِ نفس کو چھین لیتے ہیں اور بہت فرحاں ہیں کہ وہ بڑا ہی پارسا ہے۔ کسی کی طرف سے اس کے دل میں برا خیال بھی نہیں آتا۔ ہم اس کی سماعت کی صلاحیت ہی ختم کر دیتے ہیں اور فخر کرتے ہیں کہ وہ بڑا ہی پارسا ہے۔ کسی کی برائی نہیں سنتا۔ ایک پتھر کا مجسمہ ہے جہاں ڈال دیا پڑا ہے۔ نہ اپنی مرضی سے سوچ سکتا ہے نہ اپنی خواہش سے کوئی قدم اٹھا سکتا ہے نہ اپنی طبیعت

سے کوئی فیصلہ کر سکتا ہے نہ اپنی فہم کے مطابق کوئی مشورہ دے سکتا ہے اور اس طرح ہم سمجھتے ہیں کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بلند کر رہے ہیں آپ کی برتری اور فضیلت ثابت کر رہے ہیں۔ ہم اتنا نہیں سمجھتے کہ اس طرح ہم ان کی شان بلند نہیں کرتے بلکہ آپ کی شان گھٹانے کے مجرم بن رہے ہیں۔

فرشتوں میں قدرتِ الٰہیہ نے گناہ کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھی تو گناہ نہ کرنا ان کیلئے کوئی کمال نہیں ہے۔ کمال تو ہم انسانوں کیلئے ہے کہ قدم قدم پر ترغیبات و تحریصات کے جال بچھے ہوئے ہیں اور پھر گناہ نہ کریں۔

یاد رکھئے کہ ایک پیغمبر جہاں رسول ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی وہ بشر بھی ہوتا ہے اور دونوں منصبوں کی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ اس میں جہاں رسالت کی خصوصیات یعنی دیانت و امانت، جرأت و ہمت، بے کم و کاست پیغام رسانی، صبر و ضبط وغیرہ ضروری خصائص ہوتی ہیں۔ وہیں بشری خصوصیات بھی بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں۔ یعنی عقل و شعور، جذبات و میلانات، بشری احتیاجات، اختیار و ارادہ کی آزادی، حریتِ فکر و عمل، اجتہادی صلاحیت وغیرہ خصائص بھی موجود ہوتے ہیں۔ وہ رسالت اور بشریت دونوں کے خصائص کا جامع ہوتا ہے۔ اس کی ذات میں یہ تمام خصوصیات مجتمع ہو جاتی ہیں۔ یہ خصوصیات کوئی آرائشی کھلونوں (DECORATION PIECES) کی طرح محض نمائشی نہیں ہوتیں بلکہ وہ ان تمام خصائص سے اپنے مقام پر کام بھی لیتا ہے اور پورے توازن کے ساتھ کام لیتا ہے۔ اگر وہ ان صلاحیتوں سے کام ہی نہ لیں تو ان صلاحیتوں کو عطا فرمانے کا کوئی مقصد ہی نہیں رہتا۔ وہ محض کارِ عبث ہوگا جو حق تعالیٰ سے کبھی بھی سرزد نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان دونوں صلاحیتوں کے نتائج یکساں نہیں ہوتے۔ دونوں میں فرق ہوتا ہے۔

رسولِ اکرمؐ کی بشریت

قرآنِ کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کچھ عام انسانوں سے مختلف نہیں تھی، جیسے عام انسانوں کی بشریت ہوتی ہے۔ ویسی ہی بشریت آپ کی بھی تھی۔ سورہ کہف اور سورۃ حٰم سجدہ میں ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ ۔ ۱۸/۱۱۰، ۴۱/۶

آپ کہہ دیجیے کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے

ان دونوں آیات میں تصریح ہے کہ آپ کی بشریت ایسی ہی ہے جیسے دوسرے تمام انسانوں کی۔ لہٰذا جیسا کہ دوسرے انسانوں میں بشری عقل اور بشری اختیارو ارادہ ہوتا ہے۔ آپ میں بھی بشری عقل اور بشری اختیار و ارادہ موجود تھا۔

پھر سورہ انعام میں ہے :-

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ (۶/۵۰)

"اے پیغمبر! آپ کہہ دیجیے کہ میں یہ تو نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں۔ نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں (البشر ہیں ہوں) میں تو انہی احکام کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیے جاتے ہیں۔"

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۖ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۱۰/۱۵)

"میں تو انہی احکام کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیے جاتے ہیں مجھے اندیشہ ہے بڑے دن کے عذاب کا۔ اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں۔"

لہٰذا جس طرح ہم وحیٔ الٰہی کے محکوم ہیں اور ہمیں اس کی پیروی لازمی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح آپ بھی وحیٔ الٰہی کے محکوم ہیں اور آپ پر بھی اس کی پیروی لازمی ہے

لہذا وحی کے محکوم دونوں ہیں اور اس خصوصیت میں بھی آپ کو کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے۔ پھر سورہ یونس کی آیت کریمہ نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ احکام وحی کی نافرمانی سے جیسے عذاب آخرت کا ہمیں اندیشہ ہے ویسا ہی اندیشہ آپ کو بھی ہے پھر سورۂ زخرف میں ارشاد ہے:

وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ وَسَوْفَ تُسْئَلُوْنَ (۴۳/۴۴)

اور یقیناً یہ قرآن (اے پیغمبر) آپ کیلئے اور آپ کی قوم کے لئے ایک نصیحت ہے اور تم سب سے اس کی باز پرس کی جائے گی۔

لہذا جس طرح آپ کی قوم، یعنی مخاطبین اپنے عقلی واختیاری کاموں کے مسئول اور جوابدہ ہیں۔ اسی طرح آپ بھی جوابدہ ہیں۔ جس طرح سب سے باز پرس ہوتی ہے اس جوابدہی سے کوئی باہر نہیں ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ آپ کے وہ تمام کام جو عقلی اختیاری ہوتے تھے اور جو گذشتہ قرآنی تصریحات کے مطابق زیرِ حساب تھے۔ جن کے آپ جوابدہ اور مسئول تھے وہ لامحالہ وحیٔ الٰہی تو نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ وحیٔ الٰہی ہوں تو ان کی باز پرس کیسی؟ اور وہ زیرِ حساب کیوں ہوں؟

اس کے علاوہ وقتی امور میں آپ کو حضرات صحابہؓ کے ساتھ مشوروں سے پختگی حاصل کرنے کا بھی حکم تھا۔ چنانچہ آلِ عمران میں ہے:۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (۳/۱۵۹)

اور معاملات میں صحابہ سے مشورہ کر لیا کیجیے۔ پھر جب آپ کوئی پختہ رائے قائم کر لیں تو اللہ پر بھروسہ کیجیے (اور اس پر عمل پیرا ہو جائیے!)

ظاہر بات ہے کہ جن وقتی امور کے متعلق آپ کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ مشوروں کا حکم دیا گیا تھا۔ ان امور کے متعلق آپ کے پاس کوئی وحی نہیں

آچکی ہوئی تھی۔ جن امور کے متعلق وحی کے ذریعہ حکم الٰہی آچکا ہو۔ ان میں کسی سے مشورہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہر حال جیسے تمام مسلمانوں کو باہمی مشورہ کا حکم دیا گیا ہے۔

وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (۴۲ / ۳۸)

مسلمانوں کے معاملات ان کے باہمی مشورے سے طے ہونے چاہئیں۔

اس طرح آپ بھی مشورت کے مامور تھے۔

اس ساری تفصیل سے معلوم ہوگیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت بعینہٖ ایسی ہی تھی جیسی کہ عام لوگوں کی ہوا کرتی ہے۔ آپ کی ذاتِ والاصفات میں بھی وہ تمام بشری خصوصیات موجود تھیں جو عام انسانوں میں ہوا کرتی ہیں اور ان کمزوریوں کے باوجود آپ کے قدموں کا کسی موقعہ پر عمداً نہ ڈگمگانے ہی میں آپ کا فضل و کمال مضمر ہے۔ اس ساری تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ آپ کی عقل اور اختیاری باتیں یقیناً ایسی بھی ہوا کرتی تھیں جو بغیر وحی کے ہوتی تھیں اور آپ یقیناً بہت سے امور میں اپنی عقل و اجتہاد اور اہل الرائے کے مشورہ سے بھی کام لیا کرتے تھے۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ وحی کی ضرورتوں کے مطابق جس قدر قطعی اور واجب الاتباع وحی درکار تھی وہ کامل و اکمل طور پر قرآن مجید میں جمع کر دی گئی ہے باقی ضروریات عقلی ذرائع پر چھوڑ دی گئی ہیں تاکہ عقلی ذرائع اور صحیفۂ فطرت فضول اور نکمے نہ ہو جائیں نہیں نہیں بلکہ ہم وحی کے ماتحت چل کر عقلی ذرائع سے ان لوگوں کی نسبت بہت زیادہ ترقیات کر سکتے ہیں۔ جو محض عقل پر چلتے ہیں۔ پھر جو باتیں قرآن مجید نے عقلی ذرائع پر چھوڑ دی ہیں ان میں رسولِ خدا بھی بشری عقل سے بالضرور کام لیتے تھے اور اجتہاد اور مشورے بھی کرتے تھے۔ پس آپ کی معقول باتوں سے فائدہ نہ اٹھانا صریح ظلم ہے۔ جب کہ قرآن مجید حسنٌ اچھی بات کی پیروی کی تائید کرتا ہے۔ چنانچہ سورہ زمر میں ہے:۔

الَّذِیۡنَ یَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقَوۡلَ فَیَتَّبِعُوۡنَ اَحۡسَنَہٗ ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ ہَدٰىہُمُ اللّٰہُ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمۡ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ۱۸/۳۹

جو لوگ باتوں کو سنتے ہیں۔ پھر بہترین بات کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنہیں اللہ نے راہنمائی عطا فرمادی ہے اور یہی لوگ درحقیقت اہلِ خرد و دانش ہیں۔

اور سورہ قصص میں ہے۔

قُلۡ فَاۡتُوۡا بِکِتٰبٍ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ہُوَ اَہۡدٰی مِنۡہُمَاۤ اَتَّبِعۡہُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ۴۹/۲۸

"اے پیغمبر! کہہ دیجئے کہ اللہ کے پاس سے کوئی دوسری کتاب لے آؤ جو قرآن اور تورات سے زیادہ ہدایت والی ہو تو میں اس کا اتباع کروں گا۔ اگر تم سچے ہو!"

بہرحال قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ ہر احسن یعنی متوازن اور زیادہ بہتر بات اور اہدیٰ یعنی زیادہ ہدایت والی اور راہنمائی کرنے والی بات اس قابل ہے کہ اس کا اتباع کیا جائے تو ظاہر ہے کہ اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عقل و اختیار سے اجتہاد فرما کر کوئی بات بتائیں تو اس کے احسن و اہدیٰ ہونے میں کیا شک کیا جاسکتا ہے۔ کیا اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل ہی سے مستفید اور مستفیض نہ ہونا صریح کفرانِ نعمت نہیں ہے؟ یاد رکھیئے کہ احادیث نبوی بحیثیت معقول اور احسن و اہدیٰ ہونے کے ہماری بھی ہیں اور ہم ان کی اس حیثیت سے بڑی قدر کرتے ہیں۔ لیکن ہم انہیں بحیثیت وحی کے ماننے سے اختلاف کرتے ہیں۔

ساری بحث کا ماحصل یہ ہے کہ وہ چیز جس میں غلطی کا امکان نہ ہو اور جس میں تغیر و تبدل نہ کیا جاسکتا ہو۔ وہ صرف وحیٔ الٰہی ہی ہوسکتی ہے اور بس۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس وحیٔ الٰہی کی تلاش کے لئے کیا ہمیں دربدر مارے پھرتے رہنا چاہیے اور کیا اس کی جستجو میں ہمیں کہیں تورات کو اور کہیں انجیل کو اور کہیں زبور کو

اور کہیں ملتِ ابراہیمؑ اور صحفِ ابراہیمؑ کو اور کہیں دیگر انبیار کی کتب کو اور کہیں ان انبیار کی حدیثوں کو اور کہیں بخاری کو اور کہیں مسلم کو اور کہیں ابوداؤد کو اور کہیں ترمذی کو اور کہیں نسائی کو اور کہیں ابن ماجہ کو اور کہیں موطا امام مالک کو اور کہیں دوسرے اماموں کی مسندوں معجموں اور مستدرکوں کو اور کہیں اسمار الرجال کی ضخیم ضخیم کتابوں کو ڈھونڈتے پھرنا چاہیئے؟ اور پھر باوجود اس کے بھی تمام الٰہی وحیوں کے مل جانے کا کبھی بھی یقین حاصل نہ ہو۔ یا کیا یہ مناسب ہے کہ حق تعالیٰ خود ہی رحم فرما کر ضروری وحیوں کا ایک ہی دستور العمل تیار کر کے ہمیں دے دے۔ جو اکیلا ہی ہمارے لئے کافی ہو اور تمام وحیوں کی تلاش کی تکلیف مالایطاق سے ہمیں نجات دیدے۔

ہمارا ایمان ہے کہ قرآنِ کریم کی صورت میں حق تعالیٰ نے یہ رحمت پورے طور پر ہم پر نازل فرما دی۔ یہ بات آپ ہی اپنا ثبوت ہے۔

عقلی اجتہاد جن میں غلطیاں واقع ہو سکتی ہیں وہ کبھی بھی وحی نہیں ہو سکتے

ہمارا شروع ہی سے یہ سوال ہے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محدود بشری فعل و اختیار کے کام کسی طرح بھی وحیٔ الٰہی ہو سکتے ہیں؟ اس کے جواب میں حضرات اہلحدیث نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مختار و مکلف اور جوابدہ ہونے سے ہرگز ہرگز انکار نہیں کیا بلکہ نہایت صفائی سے تسلیم فرمایا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہادات میں غلطیاں واقع ہوتی تھیں۔ مگر باوجود اس اقرار کے وہ آنحضرتؐ کے اجتہادات کو وحی کا درجہ بھی دے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کا اعتراف ہے کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر تھے آپ کو حق تعالیٰ نے بذریعہ وحی کے تفسیر قرآن کرنے کی قوت عطا فرمائی تھی۔ جیسے ہائیکورٹ یا پریوی کونسل کے جج کو کسی قانون کی صحیح تشریح کرنے کا شاہی اختیار ہوتا ہے۔"

یہ تو بالکل صحیح ہے کہ انسان اپنی طرف سے خوب کوشش کر کے کسی بات کو اپنے خیال میں صحیح قرار دے سکتا ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ بات فی الواقعہ بھی ہمیشہ ہی صحیح ہوا کرے۔ پس کسی جج کو ایسی ہی صحیح تشریح کرنے کا اختیار مل سکتا ہے جو اس کی طاقت وعقل کے مطابق ہو۔ کسی شخص کو وہ اختیار دینا (یعنی کسی کے لئے ایسا اختیار تسلیم کرنا) جو اس کی طاقت وعقل سے بڑھ کر ہو، بالکل فضول اور بے معنی بات ہے۔ اسی معقول قائدہ کے مطابق تمام بشری عقلوں کو آیات اللہ (قرآن کریم) میں تفکر و تدبر اور تعقل و استنباط کرنے کا اختیار خدا کی طرف سے ملا ہوا ہے۔ جیسے آیت نمبر ۴۷/۲۴

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (۴۷/۲۴)
تو کیا وہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں

میں عام لوگوں کے متعلق فرمایا گیا ہے۔ کہ لوگ قرآن میں تدبر کیوں نہیں کرتے؟ کیا ان کے ذہنوں پر قرآن کی طرف سے تالے (قفل) پڑے ہوئے ہیں۔ لہذا یہ اختیار (تدبر) صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشری عقل کے لئے ہی مختص نہیں ہے۔ لیکن کمال افسوس ہے کہ حضرات علمائے اہل حدیث اپنے بیانات میں رسول کی بشری عقل کو محض عقل والا ہی حق و اختیار نہیں دیتے۔ بلکہ وہ قوت و اختیار دینے پر مصر ہیں جو بشری عقل کے لئے شایاں نہیں۔

عقل و اختیاری اقوال کو وحی کہنا دوسرا خدا بنانا ہے

بذریعہ وحی کے تفسیر کرنے کی قوت عطا فرمانا اور جج کی طرح نبی کو تشریح کرنے کا شاہی یعنی خدائی اختیار ہونا۔ وحی کے ساتھ جنسی کرنا اور غیر خدا کو خدائی حق دینا ہے۔ جب کسی بشر کو کسی کام کرنے کی قوت اور اختیار دے دیا گیا تو وہ کام اس قوت و اختیار والے کا اختیاری فعل ہو گیا۔ اب اس بشر کے اختیاری فعل کو وحی الٰہی ٹھہرانا جو حق تعالیٰ کا خاص فعل ہے بشری اختیاری فعل اور خدا کے خاص فعل کو ایک بنا دینا ہے پھر حضرات اہلحدیث

کا دعویٰ ہے کہ

"عقلی فیصلوں میں چونکہ غلطی کا امکان بلکہ احتمال ہوتا ہے۔ اس لئے کسی کی ذات پر بالکلیہ بھروسا کرنا گویا اس کو احتمالِ خطار سے مبرّا جاننا ہے۔ پس آنحضرت کے فیصلوں کو بلحاظِ ان کی شخصیت کے واجب التسلیم فرمانا اور چون وچرا کی گنجائش نہ چھوڑنا صاف دلالت کرتا ہے کہ آپ جو فیصلہ فرمائیں گے وہ دوسرے عقلمندوں کے فیصلے کے مانند نہ ہوگا۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (۴/۶۵)

"تو نہیں تیرے رب کی قسم، (اے پیغمبر!) وہ مومن ہی نہیں ہو سکتے جب تک تجھے اپنے باہمی اختلافات میں حکم نہ بنائیں پھر جو کچھ آپ فیصلہ فرمادیں اس سے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور اسے پوری طرح تسلیم نہ کرلیں۔"

ناظرین حضرات اہلِ حدیث کے جوابات کا اندازہ لگاتے وقت ہمارے سوالات بھی پیشِ نظر رکھا کریں۔ یہاں ہمارے سوال صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقلی و اختیاری اقوال و افعال کے متعلق ہے کہ کیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بشری اقوال بھی وحی تھے۔ جن کے لئے آپ مکلف اور جوابدہ بھی تھے۔ حضرات علمائے اہلِ حدیث فرماتے ہیں کہ عقلی باتوں میں کسی کی ذات پر بالکل بھروسہ کرنا گویا احتمالِ خطا سے مبرّا جاننا ہے یعنی خدا ماننا ہے۔

یہ بالکل سچی بات ہے۔ ہمارے سوال کا جواب اتنی بات سے صحیح صحیح مل جاتا ہے۔ مگر اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کی شخصیت کو آپ کے بشری اور عقلی اقوال و افعال میں بھی بالکلیہ بھروسے کے لائق اور احتمالِ خطا سے مبرّا بنا دیا ہے یا یوں کہیے کہ حضور کو دوسرا خدا ٹھہرا دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ :-

اگرچہ عقل کو بالکلیہ بھروسہ کے لائق اور مبرا عن الخطا ہونے کا درجہ دینا باطل ہے مگر خدا نے رسول کی عقل کو یہ درجہ دے دیا۔ کیوں کہ حضور کے فیصلے کو بلحاظ حضورؐ کی شخصیت کے واجب التسلیم فرمادیا ہے اور چون وچرا کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ پس خدا کے ایسا درجہ واختیار دینے سے رسول کی بشری عقل ایسی قرار پاگئی کہ دوسرے عقلمندوں کے مثل نہ رہی؟ معاذ اللہ! سیدھے سوال کے جواب میں کیسے پیچ ڈالے جاتے ہیں۔ صاف نہیں کہا جاتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیاری اور عقل کے اقوال و افعال ہرگز ہرگز وحی نہیں تھے۔

قول اللہ اور قول البشر کی تمیز ہرگز ختم نہیں ہو سکتی

اگر حضورؐ کے بشری اقوال بھی وحی تھے تو قول البشر اور قول اللہ میں وحی ہونے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں رہتا۔ اس سے وہ کافر سچا بن جاتا ہے جو کہتا تھا کہ یہ قرآن اسی بشر یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے۔ قولِ محمدؐ کو قولِ الٰہی کی طرح وحی بنانا صراحتاً اس کافر کی تصدیق کرتا ہے جو کہتا تھا:

اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (۲۵/۷۴)

یہ قرآن خدا کا نہیں بلکہ بشر (محمد) کا قول ہے۔

یعنی وہ کہتا تھا کہ محمدؐ اپنے قول کو اللہ کا قول کہتا ہے اس طرح علمائے اہلِ حدیث قولِ رسول کو اللہ کا قول بتا کر تصدیق فرمارہے ہیں کہ واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول اللہ کا قول ہے۔ لیکن خدا اس کافر کے متعلق آگے فرماتا ہے:

سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ (۲۶/۷۴) میں اسے ضرور جہنم میں داخل کر کے رہوں گا۔

دائرہ اختیار

یہ امر آفتاب عالم تاب کی طرح روشن ہے کہ صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیٹے نہیں مانگ سکتے تھے اور نہ یہ سوال کر سکتے تھے کہ ہمارے بیٹوں کو طولِ حیات عطا فرمائیے۔ کیونکہ یہ کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے عقل و اختیار سے باہر تھے۔ حضور تو اپنے بیٹوں اور نواسوں کو بھی نہ بچا سکے ۔ حاصل یہ کہ جو کام حضور کے اپنے فہم و اختیار کے نہ تھے۔ ان میں حضور سے سوال نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن جو کام آنجناب کے اپنی عقل و اختیار کے تھے ، ان کا مانگنا آپ کے گھر سے جائز تھا۔ مثلاً ایک پیاسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پانی مانگ سکتا تھا۔ خواہ حضور اسے اپنے گھر سے پانی پلا دیتے یا کسی نہر یا تالاب سے یا بارش کا پانی منگا دیتے مگر وہ پیاسا حضور سے یہ سوال نہیں کر سکتا تھا کہ آپ بارش برسا کر پانی پلا دیجئے۔

اب یہ بات بالکل ہی واضح ہے کہ اسی طرح وحیٔ الٰہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے عقل و اختیار کا کوئی دخل نہیں ۔ ٹھیک جس طرح بیٹے بخشنے ، طولِ حیات عطا فرمانے اور بارش برسا دینے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ ہاں نازل شدہ وحی میں تدبر کرنے اور عقل و فہم سے کام لینے کی پوری اجازت تھی۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسائل پوچھتے تھے وہ بالکل اسی پیاسے کی طرح جو آپ سے آپ کی طاقت و اختیار کے مطابق ہی پانی مانگتا تھا۔ اپنے مسائل کا حل مانگتے تھے۔ جیسے وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ پانی پلاؤ جو ہر دفعہ اسی وقت تازہ بہ تازہ آسمان سے برسا ہو۔ اسی طرح صحابہؓ بھی یہ نہیں کہتے تھے اور نہ کہہ سکتے تھے کہ ہمیں وہ حل بتایئے جو تازہ بہ تازہ آسمان سے بذریعہ وحی نازل ہوا ہو۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بشری فہم و اختیار سے بھی بالضرور باتیں کیا کرتے تھے جو ہرگز ہرگز وحی نہیں قرار پا سکتی تھیں۔

خدا کا مخصوص فعل کسی بندہ کا اختیاری فعل قرار نہیں پا سکتا۔

اگر خدا کسی صاحب اختیار شخص کے ساتھ ایسا وعدہ فرمائے کہ تیری تمام اختیاری باتیں بھی وحی ہونگی تو اس سے لازم آئے گا کہ وہ شخص جب چاہے خدا سے بااختیار خود وحی حاصل کر سکتا ہے۔ اس طرح اس بندے کیلئے وحی پانا اور

غائبانہ باتیں تبلا دینا اختیاری فعل بن جائے گا۔ لیکن یہ قطعاً محال ہے کہ ایک چیز اللہ تعالیٰ کا مخصوص فعل بھی ہو اور وہی چیز کسی بشر کا اختیاری فعل بھی ہو۔

حاصل یہ کہ اگر رسولوں کے اختیاری فعل بھی تھے تو وہ ہرگز ہرگز وحی الٰہی نہیں ہو سکتے مگر افسوس ہے کہ آج تک ایسی سیدھی سی بات کا صفائی کے ساتھ اقرار نہیں کیا گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر وقت وحی نہیں ہوا کرتی تھی جب آپ کوئی آیت نہ لاتے تو کافر کہا کرتے تھے

وَ اِذَا لَمۡ تَاۡتِہِمۡ بِاٰیَۃٍ قَالُوۡا لَوۡ لَا اجۡتَبَیۡتَہَا ۲۰۳/۷

اور جب آپ ان کے پاس کوئی آیت نہیں لاتے تو وہ کہتے ہیں کہ تو نے خود ہی کیوں نہ اسے بنالیا۔

یعنی تو اسے خود ہی کیوں نہیں گھڑ لایا۔ تو اس کے جواب میں حکم ہوا۔

قُلۡ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ مِنۡ رَّبِّیۡ ۲۰۳/۷

آپ کہہ دیجئے کہ میں تو صرف اپنے رب کی وحی کے پیچھے چلتا ہوں۔

یعنی اپنی طرف سے بنا کر کوئی آیت پیش نہیں کر سکتا۔ میں تو وحیٔ الٰہی کے پیچھے چلتا ہوں، یہ نہیں کہ وحیٔ الٰہی میرے فہم و اختیار کے پیچھے چلتی ہو۔ اور جو بات میں کہہ دوں وہی وحیٔ الٰہی بن جائے۔

حدیث معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ کے مطابق اہل حدیث حضرات بھی تسلیم فرماتے ہیں کہ کوئی فیصلہ کرنے کے لئے پہلے قرآنِ مجید سے حکم تلاش کرنے چاہئیں۔ اگر قرآن مجید میں نہ ملیں تو حدیث کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیئے اور اگر حدیث میں بھی اس کے متعلق احکام نہ ہوں تو اجتہاد و رائے کے اصول پر عمل کرنا لازم ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ قرآن و حدیث کے باوجود بھی اہلِ علم کے نزدیک اجتہاد کر کے رائے نکالنے کی سخت ضرورت ہے۔ اسی ضرورت کے سبب سے مجتہدوں کو بھی اجتہاد کرنے پڑے

ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خود وحی نے ہی بہت کچھ عقل پر چھوڑا ہوا ہے۔ جب وحیٔ الٰہی کا منشا رہی یہ ہے کہ بہت سے مسائل کو عقل پر چھوڑ دے تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشری عقل ہی اس لائق نہ تھی کہ اس پر اسی طرح کے مسائل چھوڑے جاتے؟ کیا نعوذ باللہ آپ کو اجتہاد کے ناقابل سمجھ کر ہر ہر مسئلے کی خاطر وحی کی جاتی تھی؟ کیا جن مسائل کو خود وحیٔ الٰہی نے اپنے میں شامل نہ کر کے آج تک اجتہاد پر چھوڑ رکھا ہے۔ وہی مسائل زمانۂ رسول میں بھی اسی طرح بشری عقلوں پر نہیں چھوڑے ہوئے تھے اور اگر اس وقت وحیٔ الٰہی نے ہی ان مسائل کو بشری اجتہاد پر چھوڑنا منظور فرمایا تھا تو کیوں اب برخلافِ منشائے وحی ان بشری اجتہادوں کو وحی بنایا جائے؟

ابتدائے عہدِ رسالت میں مسلمان ضرور فوت ہوا کرتے تھے ان کی میراثوں کو بھی تقسیم کرنے کی ضرورت پڑتی تھی لیکن احکام میراث ایک مدت کے بعد مدینہ منورہ میں جا کر نازل ہوئے۔ ان میں یہ بھی فرمایا کہ خدا تمہیں غلطیوں سے بچانے کیلئے یہ بیان کر رہا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرصہ دراز تک تقسیم میراث باوجود غلطیوں کے حسب فہم ہی ہوتی رہی تھی۔ اس طرح وضو بھی ابتداء ہی سے کسی نہ کسی طرح کیا جاتا تھا۔ مگر وضو کا حکم اور طریقہ فتح مکہ کے بعد نازل ہوا۔ اس سے صاف کھل جاتا ہے کہ اس سے پہلے صحابہ رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت عقلی باتوں میں عقلی طور پر ہی کیا کرتے تھے۔ پس عہدِ نبوت میں رسول اللہ کی عقلی اطاعت بھی بالضرور ہوتی تھی اب اس عقلی اطاعت کے کچھ اور معنے بنا لینے درست نہیں۔

مقامِ حیرت

لوگ حیران ہوں گے کہ جب بات بالکل صاف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بشری اور عقلی اقوال و افعال ہرگز ہرگز وحی نہیں تھے تو ہمارے علمائے کرام کو اس کے تسلیم فرما لینے میں کونسی

دشواری ہو سکتی ہے۔ اس کے جواب میں اس کے سوا کیا کہا جائے کہ اس سچی بات کو تسلیم کر لینے سے ان کا تمام تار و پود ہی درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ہمارے علمائے کرام اگر اسے تسلیم فرمالیں تو انہیں یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ حضورِ اکرم ص کے ارشادات اور اقدامات (اقوال و افعال) دو قسم کے تھے۔ ایک تو محض تلطفِ الٰہی سے علم الیقینی کے ساتھ ملتے تھے جو وحیٔ الٰہی تھے۔ دوسرے آپ کے بشری اقوال جو خود وحی نہیں تھے۔ اس صورت میں حق تعالیٰ پر لازم تھا کہ ان دونوں کو خلط ملط نہ رہنے دے۔ کیونکہ

اوّل ——— تشریعی وحی کا بدل آئندہ (آنحضرتؐ کے بعد) کبھی نہیں مل سکتا تھا لیکن عقلی تحقیقات کا بدل ہمیشہ ممکن ہے۔

دوم ——— نیز یہ کہ اس امتیاز سے تشریعی وحی ایک بے مثل اور سہل الحصول مجموعہ میں محفوظ ہو جائے۔

سوم ——— مزید یہ کہ حق تعالیٰ اس ممتاز مجموعہ کی حفاظت کو اپنے ذمہ لے کر اور اپنے فرض کو صحیح طور پر بجا لا کر دکھلا دے کہ جس طرح حفاظت و رحمت سے ہم نے اسے اتارا ہے۔ اسی حفاظت سے اسے پہنچا بھی دیا ہے۔

چہارم ——— اگر وحی اور غیر وحی کو مخلوط رہنے دیا جاتا تو غیر محفوظ حصہ جس کی حفاظت منظور نہ تھی۔ ضرور ہی موضوع، ضعیف، غریب اور ظنی بن جاتا۔ جیسا کہ حدیثوں کا حال ہوا ہے۔ حدیثوں نے موضوع آیتیں بھی بنائی ہیں۔ مگر شکر ہے کہ اس مجموعہ (وحیٔ الٰہی قرآن کریم) کے ممتاز ہونے کے سبب وہ اس میں نہیں مل سکیں۔ موضوع آیتیں ان حدیثوں ہی میں رہیں جن میں انہیں رہنا چاہیئے تھا۔ حاصل یہ ہے کہ وحی کو غیر وحی سے ممتاز کرنا خود وحی بھیجنے والے ہی کا کام ہے۔ خدا کا یہ کام صرف قرآنِ مجید کی صورت میں ہی ملتا ہے۔ اگر قرآن کے سوا بھی کوئی وحی رسولِ خدا پر

نازل ہوئی ہوتی تو اُس کو نازل کرنے والا اس کی حفاظت بھی ضرور کر دیتا) خدا نے رسولِ خدا کی ساری وحی کو قرآنِ مجید میں لا کر وحی کی ضرورتوں کے مطابق اسے مکمل کر دیا ہے۔

خدا فرضِ منصبی سے غافل نہیں

ہمارے علمائے کرام کے خیال میں قرآنِ مجید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بشری اور عقلی اقوال وافعال کے ساتھ گڈ مڈ رہنے دیا ہے۔ اب اگر ہمارے علمائے کرام حدیثی بیانات کو وحی اور غیر وحی کا مجموعہ قرار دیں تو اس سے ثابت ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے وحی اور غیر وحی کو جدا جدا کر دینے کا فرض خود ادا نہیں کیا، بلکہ بہت کچھ ہم پر بھی چھوڑ دیا ہے تاکہ ہم خود ہی وحی اور غیر وحی کو سونگھ سونگھ اختیار کرتے رہا کریں کہ کس حدیثی قول کو وحی ٹھہرائیں اور کس کس کو رسول کی اپنی رائے قرار دیں۔

منصبِ رسالت

ہمارے حضرات علمائے کرام رسول کی بشری اور عقلی باتوں کو بھی وحی بنانا چاہتے ہیں۔ تاکہ وحی اور غیر وحی میں کسی تمیز کی ضرورت ہی نہ رہے۔ ان کے نزدیک عہدۂ رسالت ایک ایسا منصب ہے جہاں غیر وحی کو بھی وحی کا ہی امتیاز اور مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں میں قولِ بشر اور قولِ خدا کا ایک ہی مفہوم ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بشری اطاعت بھی بعینہٖ وحی کی اطاعت کے برابر ہے۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ

قرآن کے سوا کچھ مت لکھو

خود احادیث اس بات کی شاہد ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی تھی کہ مجھ سے قرآنِ مجید کے سوا کچھ نہ لکھو اور جس نے کچھ لکھ لیا ہو تو لازم ہے کہ اسے مٹا ڈالے (مسلم)، صحابہؓ نے اس پر پورا پورا عمل کیا۔ اگر کسی نے کچھ لکھا تھا تو آخر جلا دیا۔

حضرت معاویہؓ نے کسی دوسرے صحابیؓ سے کوئی حدیث پوچھی اور اپنے آدمی کو لکھنے کا اشارہ کیا۔ لیکن جب اس صحابیؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سوائے قرآن مجید کے حضور کی طرف سے کچھ لکھنے سے منع فرمایا ہے تو آپؓ نے اس لکھے ہوئے کو مٹا دیا (ابو داود تیسیر الوصول) اب ظاہر ہے کہ

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتابتِ حدیث کو ضروری سمجھتے تو ضرور اسے لکھوا کر ہم تک پہنچاتے۔ اگر صحابہ کتابتِ حدیث کو جائز جانتے تو ضرور لکھوا کر چھوڑ جاتے۔ پھر ممکن نہیں تھا کہ مسلمان رسولِ خدا یا صحابہؓ کے نوشتوں کے مٹانے کو جائز سمجھتے۔ ضرور ان نوشتوں کی قدر بخاری اور مسلم سے بدرجہا بڑھ کر ہوتی۔ لوگوں کو ان نوشتوں کی حدیثیں روایت در روایت (یعنی عن فلاں عن فلاں) کے طور پر نہ لینی پڑتیں۔ پس صحابہ کے کسی نوشتے کا موجود نہ ہونا صاف بتلاتا ہے کہ انہوں نے حدیث کی تبلیغ کو (صرف) غیر ضروری ہی نہیں بلکہ جو کچھ کبھی ضرورتاً لکھا گیا تھا اس کو بھی مٹا دیا۔ نیز یاد رہے کہ صحابہؓ کو اپنی فتوحات کے زمانہ میں رسولِ خدا کا کوئی والا نامہ یا عہد نامہ ملا ہوگا تو انہوں نے اس کو بھی باقی نہیں رکھا۔ مسلمانوں کے پاس رسولِ خدا کی انگوٹھی کا نوشتہ تک بھی قائم نہیں رہا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اردگرد کے سلاطین کے نام خطوط تحریر فرمائے تھے ان میں سے ایک خط کسی پادری کے پاس سے تھوڑا عرصہ ہوا ملا ہے۔ اس کا فوٹو لے کر دنیا میں پھیلایا گیا۔ لیکن یہ امر قابلِ غور ہے کہ مسلمان جن کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریروں کا پایا جانا قرینِ قیاس تھا وہ تو مطلقاً ان تحریروں سے خالی ہیں۔ اگر کوئی تحریر مل بھی جاتی ہے وہ غیروں کے پاس سے ملتی ہے۔ اس سے حدیث کے ساتھ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی پوری بے اعتنائی کا ثبوت ملتا ہے۔ خود احادیث کے بیان کے مطابق صحابہؓ کے زمانہ میں ایک دوسرے

سے حدیث سُن کر اس کی تغلیط بھی کی جاتی تھی۔ قرآن کے خلاف پا کر اسے رَد بھی کیا جاتا جاتا تھا۔ بعض صحابہ نے دوسروں سے حدیث کا سننا ترک کر دیا تھا۔ اس لئے کہ لوگ نرم و سخت ہر راہ پر چلنے لگے تھے۔ بعض نے خود روایت کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ تاکہ بے ضرورت غلطی کر کے جہنم مول نہ لیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حسب روایت حضرت ابوبکرؓ سے حدیث سن کر غضبناک ہوئیں اور ان سے کلام کرنا ترک کر دیا۔ یہاں تک کہ احکم الحاکمین کے پاس جا پہنچیں۔ آپ کے جنازہ پر حضرت ابوبکرؓ کو نہیں بلایا گیا۔ بلکہ رات کو چپکے سے دفن کر دیا گیا۔ یہ باتیں بخاری اور مسلم میں پائی جاتی ہیں۔ جن کی صداقت کے وہ خود ذمہ دار ہیں۔

عذرِ فعل بدتر از فعل

بعض حضرات بے نیازانہ طور پر فرما دیتے ہیں کہ حدیثیں لکھنے کی ممانعت اس لئے کی گئی تھی کہ کہیں حدیثیں قرآنِ مجید کے ساتھ مخلوط نہ ہو جائیں۔ یہ ایک بہانہ ہے۔ کیا ضرورتاً اور باتیں نہیں لکھی جاتی تھیں؟ پھر کیا وہ قرآن مجید میں مل گئیں؟ اگر حدیثوں کو بھی لکھنے کی ضرورت ہوتی تو کیا وہ بھی ضرورۃً نہیں لکھی جا سکتی تھیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے علمائے کرام کے خیال میں قرآنِ مجید کی حفاظت کا ذمہ حق تعالیٰ نے مشروط طور پر لیا تھا کہ اگر حدیثیں لکھی گئیں تو پھر حق تعالیٰ قرآنِ عزیز کی حفاظت کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔ معاذ اللہ! استغفر اللہ ایسے بہانے بنانے پر عذرِ فعل بدتر از فعل کی مثال صادق آتی ہے۔

اگر کتابتِ حدیث ضروری ہوتی تو اس کیلئے موزوں ترین زمانہ آنحضورؐ اور صحابہؓ کا تھا۔

صاحبان! اگر احادیث کو لکھنا ضروری ہوتا تو ان کو لکھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے وقت میں ہی زیادہ مناسب تھا۔ مروجہ تاریخ اسلام کے مطابق حضرت عائشہؓ اور

اور حضرت علیؓ کی جنگ میں (جمل کی جنگ میں) دس ہزار صحابہؓ کا خون بہنے کی نسبت یہ کام نہایت ضروری تھا۔ پھر حدیثوں کو اس وقت لکھے جانے سے حدیثوں کے ظنی ضُعف اور موضوع بننے کا بھی کوئی موقعہ نہ رہتا ——— برعکس اس کے حدیثوں کا زمانۂ رسالتؐ وصحابہؓ کے بہت بعد لکھا جانا بہت کچھ مُضر، نقصان دہ اور نا اتفاقی کا موجب ہوا ہے۔ لوگوں نے اپنی اپنی حدیثوں کے مجموعے الگ الگ بنا لیے ہیں۔ اور جب تک یہ مجموعے بطور وحی کے سمجھے جائیں گے۔ ان کو ماننے والے مسلمانوں کے فسادات اور اختلافات نہیں مٹ سکتے۔ ایک کتاب کے تحت میں جو اتحاد ہو سکتا ہے، مختلف کتابوں کے ماتحت ہرگز نہیں ہو سکتا ——— حدیثوں کے زمانۂ رسالت وصحابہ کے بہت بعد لکھے جانے کے سبب لوگوں نے ان کی آڑ میں قرآنِ مجید کو فائدہ پہنچانے کے بجائے سخت نقصان پہنچانے کی بھی کوششیں کی ہیں۔ نئی نئی آیتیں بلکہ نئی نئی سورتیں بھی گھڑی گئی ہیں۔ مگر شکر ہے کہ وہ متن قرآن پر اثر انداز نہیں ہو سکیں۔ وہ صرف بخاری اور مسلم اور شیعوں کی کافی اور طبری وغیرہ ہی میں بند پڑی ہیں۔ (خود بخاری شریف میں آیتِ رجم کا قرآنی آیت ہونا مذکور ہے۔ لیکن حفاظتِ خداوندی (۱۵/۹) کے مطابق اسے قرآن کریم میں آج تک جگہ نہیں مل سکی، ان کے لائق بھی وہی جگہ ہو سکتی تھی نہ کہ سچا قرآن (حفاظتِ خداوندی (۱۵/۹) کے بموجب قرآن کریم میں تو جھوٹ شامل ہی نہیں ہو سکتا۔ حدیثیں یقیناً ایسی چیز ہیں۔ جن میں جھوٹ مل سکتا ہے اور یقیناً ان میں جھوٹ ملا ہوا بھی ہے۔ پس وہ ہرگز ایسی نہیں ہو سکتیں (جو وقتی ضرورتوں کے علاوہ) ہمیشہ کے لئے مقصود ہوں۔ قیامت تک کیلئے مقصود تو صرف قرآنِ کریم ہی ہے۔

اہلِ حدیث کا مسئلہ معہٗ قرآن کی مثل ہرگز نہیں

محفوظیت کی تحدّی بھی صرف اور صرف قرآنِ مجید میں ہی موجود ہے اور دنیا میں صرف یہ ایک ہی

الہامی کتاب ہے جو خود (زمانہ رسالت میں) سننے اور دیکھنے والوں کی لکھی ہوئی آج تک دنیا میں موجود ہے۔ ہم صرف ایک الہامی کتاب کا دنیا کے لیے کافی وحی ہونا دکھلا رہے ہیں۔ مگر اہلِ حدیث حضرات مثلہٗ معہٗ بھی اس کے ساتھ ٹھہرا رہے ہیں لیکن وہ مذکورہ بالا صفات اس اپنے ٹھہرائے ہوئے مثلہٗ معہٗ میں ہرگز ہرگز نہیں دِکھلا سکتے۔

کیا تفسیر بھی تفسیر طلب ہوتی ہے؟

حدیثیں اگرچہ عربی زبان میں ہیں۔ مگر عربی مبین میں نہیں ہیں۔ ان میں مغلق مبہم اور غیر واضح الفاظ کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ پھر ان میں ایک ایک باب میں اس قدر اختلافِ کثیر کھلے طور پر پایا جاتا ہے کہ اصل منشا تک پہنچنا نہایت ہی مشکل ہو گیا ہے (پھر لطف یہ کہ انہیں قرآنِ کریم کی تفسیر بتایا جاتا ہے اور ساتھ ہی پھر خود ایک ایک جلد کی کئی کئی جلدیں شرح اور تفسیر کی لکھی گئی ہیں) قرآنِ مجید کی یہ عجیب تفسیر ہے کہ قرآنِ مجید سے بڑھ کر خود محتاجِ تفسیر ہے۔ قرآنِ کریم کی جو آئتیں اپنے مدعا پر صاف دلالت کرتی ہیں وہ بالکل واضح اور معقول ہوتی ہیں۔ مگر حدیثوں کو ساتھ ملا لینے سے پیچیدہ بلکہ قابلِ اعتراض بن جاتی ہیں۔ شاید تفسیر کا یہی منصب ہوتا ہے کہ سلجھے ہوئے مطالب و مفاہیم میں الجھاؤ پیدا کر دے؟ (یا للعجب)

یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ قرآنِ مجید پر مخالفوں کے اس قدر اعتراض نہیں ہیں جس قدر حدیثوں پر ہیں اور بے شمار آئتیں ایسی ہیں جن کو حدیثوں کے اثر سے قابلِ اعتراض بنایا جاتا ہے۔ ان اعتراضوں کے جواب میں اگر کہہ دیا جائے کہ ہم ان حدیثوں کو نہیں مانتے تو قرآنِ مجید پر سے اعتراض بالکل جاتا رہتا ہے۔ خود اہلِ حدیث بھی آریوں کے مقابلہ پر ایسا ہی کرتے ہیں اور صاف کہہ دیتے ہیں کہ ہم مشکوٰۃ وِشکوٰۃ کو نہیں جانتے۔ بحث صرف الہامی کتاب پر ہے۔ تو کیا

بالکلیہ بھروسہ کے لائق اور مبرا عن الخطار تفسیر سے یوں ہی پیچھا چھڑایا جاتا ہے اور تماشا یہ ہے کہ ان کا یہ گریز مفید بھی ہوتا ہے۔ تفسیر کا کام اعتراضوں سے بچانا ہوتا ہے نہ کہ خواہ مخواہ اعتراضوں کے نیچے دبا دینا؟

واقعہ یہ ہے کہ اسلام میں جس قدر گمراہ فرقے پیدا ہوئے ہیں یا ہوتے ہیں ان سب کا مدار انہی روایات پر ہے۔ ان کے اپنے وجود کے لئے دلیل مثلاً ہمہ کی بارگاہ ہی سے ملتی ہے۔ قرآن کی بارگاہ سے کسی کو کوئی دلیل نہیں ملتی۔

رسولِ مقبولؐ اور صحابہؓ پر ایک عجیب و غریب بہتان

بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ حدیثیں لکھنے کی ممانعت شروع میں تھی لیکن بعد میں صحابہؓ کو احادیث لکھنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اگر بات یہی ہے تو سوال یہ ہے کہ ایسی ضروری قرار دی ہوئی حدیثیں جن کے اقرار و انکار پر کفر و اسلام کا مدار سمجھا جاتا ہے۔ کیوں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نہیں لکھیں یا نہیں لکھوائیں کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کا ان کے متعلق یہ ارادہ تھا کہ وہ پہلے خوب اچھی طرح بگڑ لیں۔ بہت کچھ گم ہو جائیں اور ضعیف و موضوع بن لیں اور راویوں کی کثرت گھٹ کر ایک ایک حدیث کا راوی ایک ایک ہی رہ جائے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کو فوت ہوئے دو سو سال کا عرصہ گزر جائے اور تب امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ وغیرہ پیدا ہوں اور خود تنقیدِ روایات کے اصول و قواعد گھڑ کر لمبے لمبے سفروں کی صعوبت اٹھا کر دربدر کی ٹھوکریں کھائیں اور کہیں سے کہیں جا کر تلاش کر کر کے احادیث کو قلم بند کریں ——— کہا جاتا ہے کہ احادیث کی تلاش و تحقیق میں جو تکلیفیں اٹھانی پڑی تھیں، وہ صبر و ضبط پیدا کرنے، لوگوں کے مرتبوں کو بڑھانے اور علم کا شوق پیدا کرنے کے لئے تھیں۔ لیکن اس پر سوال یہ ہے کہ کیا انسانوں کیلئے یہ بھی کوئی اصول ہے کہ اول تو ایک

کام کو جو اپنے وقت پر، سہولت اور صحت کے ساتھ ہو سکتا ہے، نہ کیا جائے یا اسے مشکل اور مشتبہ بنایا جائے اور مناسب وقت نہ رہے تو بعد کے آنے والوں پر تحقیق و تفتیش کا بار ڈال دیا جائے تاکہ وہ صبر و ضبط سے کام لے کر ثواب حاصل کریں اور خدا کے ہاں درجے پائیں۔ اس طرح اگر امام بخاریؒ اور مسلمؒ کو تکلیفیں اٹھانے پر اجر و ثواب ملتا ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہؓ کو اپنے وقت پر تغافل برتنے کیلئے کیا ملنا چاہیئے؟ جب کہ ان کے وقت میں حدیث نویسی کا کام پوری پوری صحت کے ساتھ اور لمبے لمبے سفروں کی تکلیفیں اٹھائے بغیر اور اکثر راویوں پر عیب لگانے، کسی کو رافضی، کسی کو خارجی، کسی کو فاسق و فاجر، کسی کو کاذب اور غیر ثقہ اور مجروح بنائے بغیر ہی ہو سکتا تھا۔

فن اسماء الرجال اور متوفی بزرگوں پر کذب و فسق کا جواز

کہا جاتا ہے کہ دین کی حفاظت کے لئے کسی کو فاسق اور فاجر اور کذاب کہنا کوئی گناہ نہیں بلکہ یہ تو ایک جہاد ہے لیکن اگر حدیثوں کا اپنے مناسب وقت پر لکھا جانا ضروری تھا تو ان بزرگوں کے متعلق کیا کہا جائے گا۔ جنہوں نے دین کی اس حفاظت سے تغافل برت کر حدیثوں کو غریب و ضعیف بننے دیا اور ایسے بڑے جہاد کی مصیبت میں ڈال دیا کہ اخلاف کو اپنے متوفی بزرگوں پر جرح و تنقید کر کے کسی کو فاسق اور کسی کو کاذب اور کذاب ثابت کرنا پڑا۔

ہر معاملے کو بروقت لکھنے کی قرآنی تاکید

ادھار لین دین کا وقتی معاملہ کرنے میں تو لکھنے کی ایسی تاکید ہو کہ خود حق تعالیٰ فرمائیں کہ معاملہ تھوڑا ہو کہ بہت اس کو ضبطِ تحریر میں لے آنے میں سستی نہ کرو اور حکم فرمائیں کہ لکھانا اس فریق کی ذمہ داری ہے جسے دینا ہے اور ارشاد فرمائیں کہ اپنے مردوں میں سے دو گواہ ایسے مقرر کرو جو تمہاری پسند اور اعتماد کے

ہوں۔ اگر دو مرد ایسے نہ مل سکیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنالو۔

مطلب یہ کہ اپنے وقت کے معاملہ میں بھی ضبط تحریر میں لانے کے ساتھ ایسے گواہ ہونے لازم ہیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے بارہ میں جن کو اصولی طور پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دین میں شامل کیا جاتا ہے اور انہیں قطعاً دین اور وحی قرار دیا جاتا ہے۔ ایسا تغافل برتا گیا کہ بسا اوقات روایت اور روایت کے طور پر بھی صرف ایک مرد یا صرف ایک عورت کی روایت پر ہی بنیاد رکھنی پڑتی ہے اس سے حدیثوں کی حقیقت اور اصلیت کا پورا پتہ چل جاتا ہے۔

استقلال صرف قرآن کریم کو ہے

مختصر یہ کہ جب قرآن مجید نے ہدایت کے متعلق تمام ضروری وصیتوں کو اپنے اندر لے لیا ہے اور اس طرح دوسری الہامی کتابوں تک کا استقلال قائم نہیں رہنے دیا۔ تو کیا ضروری وصیتوں کو غیر محفوظ حدیثوں میں ہی الگ چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ قرآن کے فعل سے اس کا منصب بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ضروری حدیثوں کو قول کے حکم کے ساتھ بھی۔ اپنے اندر محفوظ کر لیتا ہے اور اندازِ حکایت کی صورت میں بھی بعد از وقوع اپنے اندر لے آتا ہے اور اس طرح رسول کے ضروری اقوال و افعال کو خود ہی روایت کر دیتا ہے۔

جب قرآن کریم نے اپنے اس فعل سے دوسری الہامی کتابوں کا استقلال ہمارے لئے قائم نہیں رہنے دیا تو کیا قرآن کریم کا وہی فعل حدیثوں کے استقلال کو قائم رکھ کر الٹا اثر دکھلا رہا ہے؟

کفار کی عداوت صرف قرآن کے ساتھ تھی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے سامنے صرف قرآن ہی پیش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ کفار کی تمام عداوت اور دشمنی اسی قرآن کے ساتھ

تھی۔ حدیثیں تو وہ آنحضورؐ سے قبل نبوّت ہی سے سنتے چلے آئے تھے۔ ان کے تمام اعتراضات بھی اسی قرآن کریم کے متعلق ہوا کرتے تھے۔ اگر قرآن مجید کے سوا کوئی اور مثلہٗ معہٗ بھی حضورؐ کی طرف سے ان کو پیش کی جاتی تھی تو کفار کو اس سے بھی عداوت اور نفرت کیوں نہیں تھی؟ اور کیوں کفار کو قرآن کے بغیر کسی مثلہٗ معہٗ کی مثل بنالانے کی تحدی نہیں فرمائی گئی؟ جواب بالکل واضح ہے، کہ حق تعالیٰ کی طرف سے تحدی تو ہے صرف وحی کے مثل بنا کر لانے کی۔ کیونکہ وحی انسان کا خاصہ نہیں خدا کا خاصا ہے۔ احادیث جبکہ وحی تھیں ہی نہیں، تو ان کے متعلق تحدی کس طرح ہو سکتی تھی۔؟ مشاہدہ اور تجربہ بھی یہی ہے کہ احادیث نبویؐ کے مثل تو بنانے والوں نے بنا بنا کر ڈھیر لگا دیئے ہیں اس طرح موضوع اور وضعی حدیثوں نے صاف ظاہر کر دیا ہے کہ حق تعالیٰ کے اس دعوے:

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا (۲/۲۴)

پھر تم یقیناً اس وحی یعنی قرآن کی مثل نہ ماضی میں بنا کر لا سکے ہو اور نہ آئندہ بنا کر لا سکو گے

کے مطابق اگر احادیثِ نبوی بھی وحی ہوتیں تو دنیا بھر کے جن و انس مل کر بھی حدیثوں کے انبار بنانا تو ایک طرف رہا، ایک حدیث بھی نہیں بنا سکتے تھے۔ آیاتِ قرآنی سے ثابت ہے کہ کفار کو صرف وحی الٰہی یعنی قرآن کے ساتھ ہی عداوت اور ضد تھی اور اسی کا وہ انکار کرتے تھے۔ اس کے ثبوت میں چند ایک آیاتِ قرآنی ہم ذیل میں درج کر رہے ہیں:۔

اوّل وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ (۳۴/۳۱)

اور کافروں نے کہا کہ ہم ہرگز ہرگز اس قرآن پر ایمان نہیں لائیں گے اور نہ ان کتابوں پر جو اس سے پہلے آچکی ہیں۔

اس جگہ کفار نے قرآنِ کریم کے ساتھ پہلی کتابوں کے انکار کا ذکر تو کیا ہے مگر کسی مثلہٗ معہٗ کا انہیں خواب بھی نہیں آیا۔ ظاہر ہے کہ نہ اس کو ماننے کا کوئی سوال تھا اور نہ کفار کو اس کے انکار کی کوئی غرض پڑی تھی۔

دوم:- وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ (۴۱/۲۶)

اور کافروں نے کہا کہ اس قرآن کو مت سنو اور اس میں شور و غوغا کرو تاکہ تم غالب آجاؤ

اس آیتِ کریمہ میں بھی کفار کے قرآنِ کریم ہی کو نہ سننے اور اس میں شور و غوغا مچانے اور بک بک کرنے کے منصوبے کی خبر دی گئی ہے ورنہ قرآن کے سوا جو احادیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ انہیں تو کفار زمانہ قبل نبوت ہی سے سنتے چلے آرہے تھے اور ان کے سننے سے انہوں نے کبھی انکار نہیں کیا تھا اور نہ اس میں شور و غوغا مچانے کا کبھی کوئی منصوبہ بنایا تھا۔

سوم:- وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۙ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۖ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ

اور جب ان کے سامنے ہماری روشن آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے تو جو لوگ ہمارے سامنے پیش ہونے کی توقع نہیں رکھتے، حیات بعد الموت پر ایمان نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اے پیغمبر اس قرآن کے علاوہ کوئی دوسری کتاب لے آؤ، یا اس میں کچھ تبدیلیاں کر دو کہ ہم اسے مان سکیں، آپ کہہ دیجئے کہ میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کر دوں۔ میں اسی

کا تابعدار ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے پروردگار کی ذرا بھی نافرمانی کروں تو مجھے بہت بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔"

اس آیتِ کریمہ میں کفار کے اس مطالبہ کی خبر دی گئی ہے کہ انہوں نے کہا کہ آپ اس قرآن کی جگہ کوئی دوسرا قرآن لے آئیں۔ یعنی اس قرآن کو اپنی احادیث کے ساتھ بدل دیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اعلان کرا دیا گیا کہ آپ کہہ دیں کہ میرے لئے یہ ممکن ہی نہیں۔ اب اگر احادیث مبارکہ بھی وحی ہی تھیں تو وحی کو وحی کے ساتھ بدلنے کے مطالبہ پر انکار کے کیا معنی؟ لہذا اس آیتِ کریمہ سے بھی ثابت ہوا کہ احادیثِ مبارکہ وحی نہیں تھیں اور کفار کو انکار صرف اور صرف وحیٔ الٰہی یعنی قرآنِ کریم ہی سے تھا۔

چہارم: وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا (۴۱/۱۷)

اور بلاشبہ ہم نے اس قرآن میں مضامین پھیر پھیر کر بیان کر دیے ہیں تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں اور یہ قرآن سوائے بدکنے اور بھاگنے کے انہیں اور کسی بات میں اضافہ نہیں کرتا۔

اس آیتِ کریمہ میں کفار کے بدکنے اور بھاگنے کی خبر قرآنِ کریم ہی کے متعلق دی گئی ہے۔

پنجم:۔ وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۝ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۝ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا (۴۵-۴۶/۱۷)

اور اے پیغمبر! جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے درمیان اور ان لوگوں

کے درمیان جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے ایک پوشیدہ پردہ تان دیتے ہیں اور ہم ان کے دلوں پر بھی پردے ڈال دیتے ہیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ قرآن کو سمجھ سکیں۔ اور جب آپ قرآن میں اپنے یکتا پروردگار کا تذکرہ فرماتے ہیں تو وہ بدک کر اپنی پیٹھوں کے بل مڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔

وغیر ذلک من الآیات ——— قرآنِ کریم میں مومنوں پر آیات کے پڑھنے سے ہی کفار کی دست درازی کرنے کا ذکر ہے۔ قیامت میں بھی اہلِ جہنم سے قرآنی آیات ہی کے سوال کا ذکر ہے۔ احادیث اور روایات کا نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

وحی، وحی کی مخالف نہیں ہو سکتی

حق تعالیٰ کی ایک وحی دوسری وحی کے مطابق اور ایک دوسری کی موید بمنیر معاون تو ضرور ہو سکتی ہے۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ خدا ہی کے "ایک حکم کو مخدوم اور دوسرے کو خادم قرار دیا جائے۔ اس سے تو خود خدا ہی مخدوم اور خدا ہی خادم بن جائے گا۔ پس صرف ونحو، لغت وبیان وغیرہ خادموں کی موجودگی میں جبراً وحی حاصل کر لئے گئے ہیں۔ دو مخدوم وحیوں یعنی قرآن وحدیث کا ثبوت بہم پہنچانا پھر ایک کو مخدوم اور دوسری کو خادم ٹھہرا لینا پرلے درجے کے تعصب کو ثابت کرتا ہے۔ تمام خادم علوم انسانوں کی اپنی کوششوں اور کاوشوں پر چھوڑے گئے ہیں جو وحیٔ الٰہی سے علاوہ ہیں۔ پس اگر بغور بعض اہلِ حدیث حدیثیں اور روایات صرف ونحو، لغت وبیان کی طرح خادمِ قرآن ہیں تو وہ بھی یقیناً وحی نہیں ہو سکتی۔

قرآن کو خادم کیوں ٹھہرالیا گیا؟

بڑے ہی افسوس کا مقام ہے کہ ان حضرات نے قرآنِ کریم کو بالکل ہی حدیث

کے رنگ میں ڈھلا ہوا ہے اور اسی لئے یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کے قرآن پر قاضی اور حاکم سمجھتے ہیں۔ بلکہ حدیثوں اور سنتوں کو بھی قرآن محفوظ پر آج تک قاضی اور حاکم مانتے چلے آ رہے ہیں۔ قرآن مجید کا اپنا مفہوم کچھ اور ہوتا ہے۔ لیکن حدیثوں کو ساتھ ملا کر کچھ اور بنا لیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم و عزیز کو احادیث کے پیچھے چلایا جاتا ہے۔ قرآن کریم کو جو مفصل اور مبین ہے، گونگا کہتے ہیں۔ اور حدیثوں کو قرآن کی ایسی تفسیر بتلاتے ہیں جو وحی سے کی گئی ہے اس تفسیر کو بلا کسی عام اصول یا کائنات کے علوم متعارفہ کے۔ جن کی موافقت میں وحی نازل کی جاتی ہے۔ تخصیص و استثنا کرنے بلکہ صریح الفاظ کے برخلاف معنے اور مفہوم کر لینے کا حق بھی دیتے ہیں جو کسی اور عنصر کو نہیں مل سکتا۔ حاصل یہ ہے حدیثوں کو قرآن پر قاضی اور حاکم بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی جاتی۔ مگر تماشا یہ ہے کہ ساتھ ہی انہیں خادم بنا کر بھی پیش کیا جاتا ہے۔ شاید خادم کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ آقا کو بالکل اپنے رنگ میں رنگ دے۔

رسول اللہ بلحاظ بشریت بڑے نیک لیکن لوازم بشریت سے مبرا نہیں تھے۔

حدیث کے متعلق خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ انبیاء بھی اللہ کی نعمتوں کا احاطہ نہیں کر سکتے اور ان نعمتوں کے لائق شکر بجا نہیں لا سکتے۔ ایک سانس میں دو نعمتیں ہوتی ہیں۔ سانس کا اندر جا کر اندر ہی رک جانا اور باہر آ کر مطلقاً ہی خارج نہ ہو جانا، بندے کے لئے بجز عذر تقصیر کے کوئی چارہ نہیں۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ جن الفاظ کا زبان پر لانا عام داناؤں کے لئے بھی مناسب نہیں اور جن کاموں کا کرنا عام نیکوں کے خیال میں بھی نہیں آسکتا وہ رسولوں کیلئے کبھی زیبا نہیں ہو سکتے اور جو باتیں شریف گھرانوں کے لئے فی الحقیقت موجب عار

ہیں وہ رسول کے گھر میں برضائے رسول ہرگز واقع نہیں ہوسکتیں۔ حاصل یہ ہے کہ رسول ؐ ضبطِ نفس، شرافت اور ایثار میں گرے ہوئے نہیں ہوتے۔ مگر بخاری کی کئی ایک حدیثیں ایسی ہیں کہ جو کچھ ان میں مذکور ہے ان کے لکھنے سے شرم آتی ہے۔

ناظرین بخاری شریف کا باب الغسل اور باب الحیض نمونۃً خود ملاحظہ فرمائیں

اہلِ حدیث کا دعویٰ ہے کہ تمام حدیثیں فہمِ قرآن ہی ہیں۔ لیکن یہ ایسا فہمِ قرآن ہے جس کو کوئی شخص قرآنِ مجید سے کسی دوسرے کو نہیں سمجھا سکتا اور اسی لئے وہ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ فلاں فلاں چیز (مثلاً کتابی وغیرہ) کا حرام ہونا قرآن سے ثابت ہے مگر تم قرآن سے نکال کر نہیں دکھا سکتے۔ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے اسے قرآن سے سمجھا ہے۔

اہلِ حدیث حدیثوں کے فہمِ قرآن ہونے کا دعویٰ کر کے اس دعوے کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ انہیں مطلقاً کوئی شخص قرآن سے نہیں سمجھ سکتا ہے۔ خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان سب کو قرآنِ مجید سے کسی کی سمجھ میں نہیں لا سکتے تھے ورنہ انہیں اپنے فہم کو بھی قرآنِ مجید کے ساتھ جُدا مستقل اور غیر متغیر اصول قرار نہ دینا پڑتا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسا فہمِ قرآن ہے جو صرف ایک شخص کی سمجھ میں ہی آیا۔ لیکن وہ بھی معاذاللہ دوسروں کو قرآن سے سمجھانے کے قابل نہ ہوسکا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی عربی جو (۴۳/۳) کی شہادت کے مطابق ہر خاص و عام کے سمجھنے کے لئے نیز دوسروں کو سمجھانے کے لئے ہی نازل ہوئی ہے وہ ایسی نہیں ہے کہ خود رسولؐ بھی اپنے سمجھے ہوئے مسائل کو خود قرآن کے الفاظ سے کسی دوسرے کو نہ سمجھا سکے۔ البتہ رسول کی حدیثی عربی خدا کی نازل کردہ عربی مبین سے ایسی واضح تر اور روشن تر ہے کہ جسے تمام و کمال ہم خود بھی سمجھ سکتے ہیں اور دوسروں کو بھی سمجھا سکتے ہیں۔ اس سے قرآنِ کریم کی عربی کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اس سے قرآنِ مجید کی عربی

بھی بے مثل نہیں رہتی اور حق تعالیٰ کا یہ دعویٰ بھی غلط ہو جاتا ہے کہ ہم نے قرآن کو عربی بنا کر اس لئے بھیجا ہے کہ تم سب اسے سمجھو۔ افسوس صد افسوس! فہم قرآن تو وہی ہو سکتا ہے جو خود قرآن سے سمجھایا جا سکے۔ اس کے برعکس روایات جو قرآن کا فہم نہیں۔ محض نام رکھ دینے سے قرآن کا فہم نہیں بن سکتیں

تفسیر القرآن بالقرآن

تفسیر القرآن بالقرآن ہی قرآن کے شایان شان تفسیر ہوتی ہے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ جب قرآن کی تفسیر تصریف آیات کے ذریعے سے خود قرآن کریم سے کی جائے تو وہ کس قدر عالی پایہ کی ہوتی ہے۔ یہی تفسیر تفسیر کی اصل شان دکھاتی ہے۔ تفسیر وہ نہیں ہوتی کہ قرآن تو یہ فرمائے کہ "ظالم لوگ رسول کو مسحور یعنی سحر زدہ کہتے ہیں

وَ قَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۲۵/۸

"اور ظالم لوگ کہتے ہیں کہ تم تو ایک ایسے شخص کی پیروی کر رہے ہو جس پر جادو کیا گیا ہے"

یعنی وہ بکواس کرتے ہیں۔ جھوٹ بولتے ہیں کہ آپ پر جادو کر دیا گیا ہے اور ادعائی تفسیر (روائتی تفسیر) کہے کہ ہاں سُحِرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (رسول پر جادو کر دیا گیا تھا) معاذ اللہ معاذ اللہ، اللہ کے رسول پر جادو ہو گیا۔ یہ لوگ اس کا نام تفسیر رکھتے ہیں اور اسے اپنی طرف سے صحیح بنانے کے لئے ایڑھی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ شاید ان کے ہاں تفسیر اسی کو کہتے ہیں کہ جس میں ایسی بناوٹی باتیں بنانی پڑیں۔ استغفر اللہ

علماء کرام ایک طرف تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دماغ کو مدت تک جادوگروں کے قبضے میں دے دیتے ہیں اور حضور کے دماغ کا مختل ہونا بھی مانتے ہیں اور یہ بھی مانتے ہیں کہ جس عرصہ میں آپ پر جادو ہو گیا تھا اس عرصے میں یادداشت تک بیکار ہو چکی تھی اور یہ بھی مانتے ہیں کہ آپ کی باتیں وحی خفی تھیں جو جادو زدگی کے دوران بھی جاری تھی۔ تعجب یہ ہے کہ وحی اور جادو کی آمیزش کا تصور اہل روایات

کے ہاں ہی قابلِ قبول ہو سکتا ہے جبکہ اہلِ حدیث کے اس عقیدہ سے یہ چیز نکھر کر عیاں ہو رہی ہے کہ آنحضورؐ کے جادو زدگی کے عرصہ میں لا محالہ وحیٔ خفی بھی جادو زدہ ہی ماننی پڑتی ہے۔ حیرت اس امر پر ہے کہ اہلِ روایات تو فرماتے ہیں کہ حضور پر جادو ہوا، یاد داشت جاتی رہی۔ عقل مختل ہو گئی۔ مگر اسی عقل کے متعلق دوسری طرف یہ تسلیم نہیں کرتے کہ حضور اپنی بشری عقل سے بھی کام لیتے تھے اور اور وہ بشری عقل کے کام اس لائق ہوتے تھے کہ ان کے مناسب ان کی اطاعت کی جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ وحیٔ خفی کا نظریہ صرف روایات واحادیث کو منوانے کے لئے ایجاد کیا گیا ہے اور اسی کو سہارا دینے کے لئے اعتراضات کئے جاتے ہیں کہ فلاں حوالہ قرآن سے دکھاؤ فلاں محکی عنہ قرآن سے دکھاؤ۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ جب ان سے کہا جائے کہ کیا آپ اس کا حوالہ اپنی وحیٔ خفی سے دکھا سکتے ہیں تو بجائے اس کے کہ خدا کے نازل کردہ جو الفاظ ہم سے مانگے جاتے ہیں وہ دکھائے جائیں یا ان کے متبادل الفاظ ہی دکھائیں۔ اٹکل پچو باتیں کرنی شروع کر دیتے ہیں کہ قرآن نے یوں نقل فرمایا ہے، تو لا محالہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرما دیا ہوگا۔ یا پھر زمانہ رسالت سے دو سو سال بعد کے کسی راوی کے الفاظ پیش کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔

عجیب و غریب لطیفہ

علمائے حدیث کا دعویٰ ہے کہ قرآن مجید کی طرح حدیثی وحی بھی آہستہ آہستہ نازل ہوا کرتی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے اقوال وافعال ان وحیوں کے بعد ان کی مطابقت میں سرزد ہوتے تھے۔ لیکن جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ رسول اللہ کے ہر قول و فعل سے پہلے قرآن مجید سے خارج ان حدیثی وحیوں کو پیش کرو جن کی بنا

پر حضورؐ کے وہ اقوال و افعال واقع ہوتے تھے تو جواب میں سکوت اختیار فرما لیتے ہیں۔ مگر اللہ کی کتاب کو کافی سمجھنے والوں سے محکی عنہ پوچھتے ہیں کیا یہ ایک لطیفہ نہیں ؟ (مثلاً ہم اہلِ حدیث حضرات سے پوچھتے ہیں کہ وہ حدیثی وحی پیش فرمائیں جس کے مطابق آنحضورؐ نے منافقوں کو جنگ سے پیچھے رہ جانے کی اجازت دے دی تھی اور قرآنی وحی نے حدیثی وحی کی مخالفت کرتے ہوئے (۹/۴۳)۔ آنحضورؐ کو تنبیہ فرمائی تھی کہ (لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (آپ نے انہیں کیوں اجازت دی ہے) کیا اس سوال کا اہلِ حدیث کے پاس کوئی جواب ممکن ہے ؟ ہرگز نہیں۔ ان محترم بزرگوں کے لئے کوئی چارہ نہیں کہ (۳۶/۶۹) کی قرآنی وحی کو بصدقِ دل تسلیم کریں کہ آنحضورؐ کو قرآن کے سوا کسی بھی اور وحی کی تعلیم نہیں دی گئی تھی۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ (۳۶/۶۹)

ہم نے اپنے نبی کو شعر و شاعری کی تعلیم نہیں دی۔ ہم نے تو اسے صرف اور صرف ذکر یعنی قرآنِ مبین کی تعلیم دی ہے۔

ہم پوچھتے ہیں کہ کیا نفی اثبات کے حصر کے بعد بھی کسی وحی خفی کی تعلیم کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ اسی طرح سورہ انعام میں انتہائی حصر کے ساتھ فرمایا ہے

قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ۭ قُلِ اللّٰهُ ۣ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۣ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۭ ۶/۱۹

ان سے پوچھو کس کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے ؟ کہو میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے کہ صرف یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ تمہیں بھی اس کے ذریعہ متنبہ کردوں اور قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کو بھی۔

سورہ رحمٰن میں بھی اسی چیز کی تائید موجود ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۭ (۵۵/۱-۲)

"رحمٰن نے قرآن ہی کی تعلیم دی"

کیا حضرات علمائے اہلِ حدیث بتا سکتے ہیں کہ کہیں خدا نے الرحمٰن علّم الروایات یا علم بالوحی الخفی بھی فرمایا ہے ؟ پھر ایک اور لطیفہ ملاحظہ فرمائیں کہ جب بقول اہلِ حدیث قرآن بھی وحی ہے اور حدیث بھی وحی ہے تو حدیثوں کو وہ روائتیں کیوں کہتے ہیں۔ آئتیں کیوں نہیں کہتے ؟ زیادہ سے زیادہ انہیں غیر متلو آیات کہہ دیا کریں۔ اپنے دعویٰ کا کچھ تو پاس کریں۔ مزہ تو اس میں ہے کہ جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ یہ قرآن کی آیت ہے۔ اسی طرح یہ بھی کہیں کہ یہ بخاری شریف کی آیت ہے۔ حیرت ہے کہ بخاری شریف کے تیس پارے تو بنا لئے مگر حدیثوں کو آئتیں نہ بنا سکے۔ سبحان اللہ کیا رعب ہے قرآن کا۔

برادران! آپ نے دیکھ لیا کہ حدیثی وحی کی قدر اللہ تعالیٰ کے نزدیک کیا ہے خدا تعالیٰ نے اس کو غیر وحی کے ساتھ اس طرح مخلوط کر دیا کہ اسے سونگھ سونگھ کر دریافت کرنے کی ضرورت ہے لیکن افسوس ہے کہ میری قوتِ شامہ ایسی تیز نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ نے قرآن مجید کی طرح ممتاز کر کے اسے پہنچانا ہی نہیں چاہا۔ قرآنِ پاک بالیقین ممتاز مجموعۂ وحی ہے۔ اس میں حکومت و تجارت اور بیاج و قرضہ اور رہن اور دیگر مالی انتظامات اور کاتبوں کی کتابت اور نکاح اور طلاق اور نہانے دھونے اور رشتہ داروں کے گھروں سے کھانے اور اکٹھے یا علیحدہ کھانے اور شکاری جانوروں کو سکھانے اور ان سے شکار کرانے اور شہد سے شفا ہونے اور جنگ کرنے اور سزائیں دینے اور ایسے ہی اور بہت سی باتوں کا بیان ہے۔ قرآن مجید میں ان باتوں کی تردید و تصدیق بھی موجود ہے جو رسولِ کریمؐ اور دوسرے لوگوں کو پہلے دینوں اور پہلی روایتوں سے اور پہلے تجربوں سے معلوم تھیں۔ قرآن مجید میں پہلے رسم و رواج اور خیالات اور آراء کی تصدیق پائی جاتی ہے۔ اگر وحی و غیر وحی

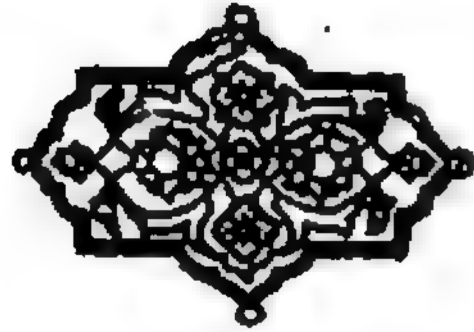
کے پرکھنے کے یہی قاعدے ہیں جو مولانا اور شاہ صاحب نے فرمائے ہیں۔ تو کیا ہم اس طرح سے قرآن مجید کی کسی بات کو وحی اور کسی بات کو غیر وحی ٹھہرا سکتے ہیں تو کیا تورات اور انبیاءؑ پر یہی قواعد جاری کر سکتے ہیں۔

برادران! رسولِ کریمؐ کے گھر میں لوگ کھانے کے لئے آتے اور کھانا کھاکر باتوں کی دلچسپی میں بیٹھے رہتے تھے۔ حضورؐ کو اس سے بڑی تکلیف ہوتی تھی ۔ آنجناب پوری طرح سے جانتے تھے کہ لوگوں کی یہ حرکت اچھی نہیں تھی۔ لیکن حضورؐ حیاء کے سبب سے انہیں کچھ نہیں کہتے تھے۔ جب قرآن مجید میں وہی حکم نازل ہوا تو اس وقت آنجنابؐ نے اسے وحی کا حکم سمجھ کر اور حیاء کے خیال کو بالائے طاق رکھ کر کھلم کھلا پہنچا دیا۔ اگر آنجناب کے پاس کوئی ایسا گر ہوتا جو مولانا نے پیش کیا ہے اور جس سے بلا تصدیق قرآن وحی و غیر وحی میں فرق ہو سکتا تو حضورِ انورؐ بالضرور قرآن سے پہلے ہی پہچان لیا کرتے کہ میری یہ بات ہمپایۂ وحی ہے اور اس لئے اس کی تبلیغ ضروری ہے۔ اندریں صورت آنجنابؐ حیا کے باعث اس کی تبلیغ سے ہرگز ہرگز نہ رکے رہتے۔ اگر رسولِ مقبول کو کوئی ایسا قاعدہ معلوم ہوتا تو آنجناب اپنی معلومات کے متعلق پہلے ہی سمجھ لیتے کہ یہ وحی ہے اور یہ وحی نہیں۔ قرآن مجید کے اترنے کا انتظار نہ کرتے اور اپنی ایسی رائیوں پر عمل درآمد نہ کرتے جس کا نتیجہ نقصان دہ اور ایذا رساں ہوتا تھا۔

اس سے سورج کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ کسی بات کو اس کی ذاتی حیثیت کے لحاظ سے وحی یا غیر وحی سمجھنے کا کوئی عام قاعدہ موجود ہی نہیں تھا۔ قرآن مجید کی تصدیق کے بغیر نہ تورات کی کوئی بات اب ہمارے لئے وحی کی طرح ماننے کے قابل ہے اور نہ انجیل کی حدیث۔ تو صرف لوگوں کو خاص طریقوں کا غلام بنانے کے لئے اور قابلِ اعتراض باتوں کو منوانے کے لیئے وحی یا ہمپایۂ وحی ٹھہرائی گئی ہے۔

افسوس لوگوں نے قرآنِ مجید کو حدیثی تفہیم کے ماتحت کر کے اس کی فراخی اور عالی ظرفی اور حکمت کو تباہ کر دیا ہے اور آئندہ اصلاح کرنے اور ترقیات پانے سے روک دیا ہے اور قرآنِ حکیم کی حکیمانہ تبلیغ میں روڑا اٹکا دیا ہے اور کافرگروں کے ہاتھ میں ایک حربہ دے دیا ہے۔

(ماخوذ از "تسہیل برہان القرآن" از حضرت خواجہ احمد الدین امرتسری ؒ)
(صفحہ ۱۲۱ تا ۱۲۸)



وحی صرف قرآن میں ہے

خواجہ ازہر عباس صاحب نے اپنے ایک مقالے میں تحریر کیا ہے کہ وحی صرف قرآن میں ہے اور خارج از قرآن وحی (وحی خفی) کا تصور باطل ہے چنانچہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

• چونکہ انسانی عقل مسائل حیات کا صحیح حل پیش کرنے سے قاصر ہے اس لئے خدا تعالیٰ نے اپنی رحمتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کے باعث نوعِ انسان کی مسلسل راہنمائی فرمائی اور متواتر پے در پے انبیاء کرام مبعوث فرمائے تاکہ ان کے توسط سے انسان کو ہدایتِ خداوندی حاصل ہوتی رہے۔ تمام انبیاء کرام کو وحی الٰہی سے نوازا گیا اور جب سلسلہ بعثت انبیاء کرام منقطع کیا گیا تو آخری وحی کو قرآنِ کریم کے اندر محفوظ کر دیا گیا اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی۔

وحیٔ الٰہی صرف قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ خارج از قرآن وحی کا تصور باطل ہے۔ اُمتِ مسلمہ کی بدقسمتی کا وہ پہلا دن تھا جس دن یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ کچھ وحی قرآن کے اندر ہے اور کچھ وحی قرآن کے باہر۔ یہ عقیدہ اپنے اپنے نظریات کو منوانے کرنے کے لئے قائم کیا گیا تھا اور اس نے مسلمانوں میں ایک مستقل عقیدہ کی شکل اختیار کر لی اور ان کی تباہی کا باعث بنا۔ اس سے ایک ایسا چور دروازہ کھل گیا کہ ہر عقیدہ کو وحی الٰہی قرار دے کر حضور کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ لیکن قرآن کریم سے اس عقیدہ کی کوئی سند نہیں ملتی۔ قرآن عزیز سے یہی واضح ہوتا ہے کہ وحیٔ الٰہی صرف قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کی تائید میں قرآنی دلائل اور اس کے بعد عقلی دلائل

پیش کئے جائیں گے۔ آخر میں ان الزامی جوابات اور اشکالات کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ جو علماء کرام کی طرف سے وحی کو صرف قرآن کریم میں محفوظ ماننے پر وارد کئے جاتے ہیں۔ وما توفیقی الا باللہ

وحی صرف قرآن میں ہونے کے دس دلائل

(۱) موحی (خدا تعالیٰ) کا ارشادِ گرامی ہے کہ اَوْحَیْنَا اِلَیْكَ هٰذَا الْقُرْاٰن اور موحی الیہ (حضورؐ) کا ارشاد ہے۔ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰن (۶/۱۰) هٰذَا کا اسم اشارہ ساتھ لانے سے حصر کر دیا گیا کہ یہی قرآن ہم نے نازل کیا اور یہی قرآن مجھ پر نازل کیا گیا۔ دونوں آیات سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کے علاوہ کسی چیز کو وحی کرنے کی خبر قرآن میں نہیں ہے۔

۱ وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ (۶/۱۹)
مجھ پر یہ قرآن نازل کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں اس کے ذریعے ڈراؤں اور ہر وہ شخص جس کے پاس یہ پہنچے وہ بھی اس کے ذریعے ڈرائے۔

۲ قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْیِ کہدو بجز ایں نیست کہ میں تمہیں وحی کے ذریعہ ڈراتا ہوں۔

پہلی آیت میں انذار بذریعہ قرآن فرمایا اور دوسری آیت میں انذار بذریعہ وحی جس سے ثابت ہے کہ وحی قرآن کریم ہے۔ وحی اور قرآن کے الفاظ ایک دوسرے کی جگہ Substitute کردئے گئے ہیں۔

۳ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (۴/۱۰۵) فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۱۰۸)

پہلی آیتِ کریمہ میں حکم ہے کہ ہم نے تیری طرف کتاب نازل کی تاکہ تو لوگوں کے درمیان حکومت کرے یا فیصلے۔ بذریعہ اس علم کے جو تجھے قرآن کریم سے حاصل ہوا۔

دوسری آیتِ مجیدہ میں حکم ہے کہ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہ کے مطابق فیصلہ کرو۔ دونوں آیاتِ کریمات میں کتاب اور بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہِ ایک ہی چیز کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور دونوں الفاظ ایک دوسرے کے متبادل استعمال کئے گئے ہیں جس سے ثابت ہے کہ کتاب اور بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہ ایک ہی چیز ہے۔

مَا یُوْحٰیۤ اِلَیْکَ اور قرآن ایک دوسرے کے متبادل استعمال کئے گئے ہیں!

(۴) فَلَعَلَّکَ تَارِکٌۢ بَعْضَ مَا یُوْحٰیۤ اِلَیْکَ وَضَآئِقٌۢ بِہٖ صَدْرُکَ اَنْ یَّقُوْلُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْہِ کَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَہٗ مَلَکٌ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ نَذِیْرٌ ؕ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ وَّکِیْلٌ ۔ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىہُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِہٖ مُفْتَرَیٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۱۳/۱۲)

جو چیز تمہارے پاس وحی کے ذریعے بھیجی ہے ان میں سے بعض کو شاید تم فقط اس خیال سے چھوڑ دینے والے ہو اور تم تنگدل ہوتے ہو کہ مبادہ یہ لوگ کہہ بیٹھیں کہ ان پر خزانہ کیوں نہیں نازل کیا گیا۔ ان کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا۔ تم تو صرف ڈرانے والے ہو اور خدا ہر چیز کا ذمہ دار ہے کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے (قرآن) اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے۔ تو تم کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو ایسی دس سورتیں بنا لاؤ اور خدا کے سوائے جس جس کو تم بلا سکو مدد کے لیے بلا لو۔

از ترجمہ شاہ عبدالقادر (مرحوم)

وَمَا کَانَ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ یُّفْتَرٰی مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلٰکِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْہِ وَتَفْصِیْلَ الْکِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْہِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىہُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّثْلِہٖ وَادْعُوْا

مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۰/۲۴)
اور یہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ خدا کے سوا کوئی اور اپنی طرف سے جھوٹ موٹ بنالے بلکہ یہ تو جو کتابیں پہلے کی اس کے سامنے موجود ہیں اس کی تصدیق اور ان کتابوں کی تفصیل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سارے جہان کے پروردگار کی طرف سے ہے۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس کو رسول نے جھوٹ موٹ بنالیا ہے۔ اے رسول! تم کہو کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ایک ہی سورۃ اس کے برابر کی بنا کر لاؤ اور خدا کے علاوہ جسے چاہو بلا لو۔"

پہلی آیت میں افتریٰ کا الزام مایوحیٰ کے لئے ہے۔ دوسری آیت میں افتریٰ کا الزام قرآن کریم کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ پہلی آیت میں مایوحیٰ الیک کیلئے تحدی کی گئی ہے کہ اس کے مقابلہ کی دس سورتیں بنالاؤ۔ دوسری آیت میں قرآن کریم کے لئے Challange کی گئی ہے کہ قرآن کریم جیسی کوئی سورۃ بنالاؤ۔ دونوں آیات کے ساتھ پڑھنے سے یہ نتیجہ بالکل واضح ہے کہ مَا یُوحیٰ صرف قرآن کریم ہے۔ علاوہ ازیں دونوں آیات کے الفاظ تک ایک جیسے ہیں۔ صرف اتنا فرق ہے کہ جس چیز کو پہلی آیت شریفہ میں مایوحیٰ کہا گیا ہے اسی کو دوسری آیت میں قرآن کہا گیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ وحی صرف قرآن عزیز میں ہے۔ دونوں الفاظ کو ایک دوسرے کے متبادل استعمال کیا گیا ہے۔

وحی صرف متلو ہے

5 ہمارے ہاں عقیدہ کے طور پر وحی کو دو قسموں میں منقسم کیا ہوا ہے۔ ایک وحی متلو جو قرآن کریم میں محفوظ ہے اور دوسری وحی غیر متلو جو قرآن کے باہر ہے۔ ان کیلئے وحی جلی اور وحی خفی کے الفاظ بھی علی الترتیب استعمال کئے جاتے ہیں مگر قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ وحی ساری کی ساری صرف متلو ہے۔ لہذا قرآن کے

اندر محفوظ

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟
عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ (۱۳/۳۰)

اے رسول! اسی طرح ہم نے تم کو اس اُمت میں بھیجا ہے جس سے پہلے اور
بہت سی امتیں گذر چکی ہیں تاکہ تم ان کے سامنے اس کی تلاوت کرو جو ہم نے
تمہیں وحی کیا ہے۔

اس آیتِ کریمہ سے واضح ہے کہ مطلق ما یوحی متلو ہے جس کی تلاوت حضور فرمایا کرتے تھے۔ اور وحی ساری متلو ہے جو قرآن میں محفوظ ہے۔ غیر متلو وحی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

امت صرف قرآن کی وارث ہے
وحی خارج از قرآن کی وارث نہیں

(۶) وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌ بَصِيْرٌ۔ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ــــ اور ہم نے جو کتاب تمہارے پاس وحی کے ذریعے بھیجی وہ بالکل ٹھیک ہے اور جو کتابیں (اس سے پہلے کی) اس کے سامنے ہیں ان کی تصدیق بھی کرتی ہے۔ بیشک خدا اپنے بندوں سے خوب واقف ہے اور دیکھ رہا ہے۔ پھر ہم نے اپنے بندوں میں سے خاص ان کو کتاب کا وارث بنایا جنہیں ہم نے منتخب کیا۔

اس آیت میں مِنْ بیانیہ ہے اور کسی صورت میں تبعیضیہ نہیں بن سکتا۔ کیونکہ اگر تبعیضیہ قرار دیا جائے تو اس کے معنی ہوں گے کہ قرآن کا بعض حصّہ حق ہے اور بعض باطل۔ لیکن چونکہ یہ بات نہیں ہے اس لئے یہاں مِنْ بیانیہ ہی لیا جا سکتا ہے اور آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو کچھ وحی کیا گیا ہے وہ کتاب ہے۔

نیز یہ کہ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ سے مزید وضاحت کی گئی کہ وحی صرف کتاب ہے جس کا وارث امتِ مسلمہ کو قرار دیا گیا ہے۔ امتِ مسلمہ صرف کتاب کی وارث ہے اور وحی قرآن کریم کے علاوہ بھی ہوتی تو امتِ مسلمہ اس کی بھی وارث قرار پاتی۔ یہ آیتِ کریمہ ایسی برہانِ قاطعہ ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ امتِ مسلمہ صرف قرآن کی وارث ہے اور اس کے اتباع کی مکلف۔

مَا یُوحیٰ اور قرآن ایک ہی چیز ہے

۷۔ وَاتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتَابِ رَبِّکَ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ

ترجمہ: اور پڑھ جو کچھ وحی کی گئی ہے۔ طرف تیری کتاب پروردگار تیرے سے نہیں کوئی بدلنے والا باتوں اس کی کو۔ (شاہ عبدالقادر)

اِنَّمَا اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِیْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ کُلُّ شَیْءٍ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ وَاَنْ اَتْلُوَ الْقُرْاٰنَ ۲۷/۹۲

سوائے اس کے نہیں کہ حکم کیا گیا ہوں میں کہ عبادت کروں پروردگار اس شہر کے کو۔ جس نے حرمت دی اس کو اور واسطے اسی کے ہے ہر چیز اور حکم کیا گیا ہوں میں یہ کہ ہوں میں مسلمانوں سے اور یہ کہ پڑھوں میں قرآن۔

پہلی آیت میں مَا اُوْحِیَ کی تلاوت کا حکم ہے اور دوسری آیت میں قرآن کریم کی تلاوت کا حکم ہے جس سے ظاہر ہے کہ ما اوحی اور قرآن کریم ایک چیز ہے اور دونوں الفاظ ایک دوسرے کے متبادل استعمال کئے گئے ہیں اور ما اوحی صرف قرآن ہے نیز یہ کہ پہلی آیت میں مِنْ بیانیہ ہے تبعیضیہ کسی طرح نہیں ہو سکتا۔

کتاب اور ما انزل ایک ہی چیز ہے

(۸) هٰذَا کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ

مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

اور یہ کتاب ہے آتاری ہم نے اس کو برکت والی۔ پس پیروی کرو اس کی اور پرہیزگاری کرو تاکہ رحم کئے جاؤ۔

اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءَ ۔ پیروی کرو اس چیز کی کہ آتاری گئی ہے تمہاری طرف پروردگار تمہارے سے اور مت پیروی کرو سوائے اس کے دوستوں کی۔

پہلی آیت میں کتاب کے اتباع کا حکم ہے اور دوسری آیت میں مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ کے اتباع کا حکم ہے۔ صرف اللہ کو ایک دوسرے کی جگہ رکھا گیا ہے۔ جس سے ثابت ہے کہ ما انزل صرف کتاب ہے۔

نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ قرآن ہے۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ کَفَّرَ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ

اور جو لوگ کہ ایمان لائے اور کام اچھے کئے اور ایمان لائے اس چیز کے ساتھ کہ آتاری گئی ہے محمد کے اوپر اور وہ حق ہے پروردگار ان کے سے دور کیں ان سے برائیاں ان کی اور سنوارا حال ان کا۔

یہاں نزل علی محمد کا ذکر کیا گیا ہے۔ دوسری آیت میں قرآن کریم ہی کو وَاِنَّهٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ فرمایا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ تنزیل یعنی قرآن کریم ہے۔

معارضہ مِمَّا نَزَّلْنَا کا کیا گیا ہے۔ صرف قرآن کا نہیں۔

وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۔ اس آیت میں معارضہ مِمَّا

نَزَّلْنَا کا کیا گیا ہے۔ صرف قرآن کا نہیں۔ یہاں یہ بات بڑی غور طلب ہے کہ اگر قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز بھی منزّل من اللہ ہوتی تو اس کے مقابلہ کی تحدی بھی پیش کی جاتی اور ارشاد ہوتا کہ فَأْتُوا بِسُورَةٍ أَوْ بِحَدِيثٍ مِّن مِّثْلِهِ لیکن یہاں مِمَّا نَزَّلْنَا (مُنَزَّلٌ مِّنَ اللهِ) کو صرف سورتوں پر مشتمل قرار دیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ اس آیتِ کریمہ میں (مُنَزَّلٌ مِّنَ اللهِ کا (CRITERION) محک و میزان نکھار کے سامنے پیش کر دیا گیا ہے کہ منزل من اللہ صرف وہ ہے جس کا مثل نہ بن سکتا ہو۔ اب اس معیار کے مطابق صرف قرآنِ کریم ہی وہ کتاب ہے جس کا مثل آج تک نہیں بن سکا ورنہ احادیثِ مبارکہ کا مثل تو اس قدر کثیر تعداد میں ہے کہ اس کی صحت وسقم جانچنے کے لئے مستقل ایک علم کی ضرورت درکار ہوتی ہے۔ اور اس کے باوجود آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ صحیح احادیثِ مبارکہ کونسی ہیں اور غلط کونسی۔

اختصار کے پیش نظر یہ دس دلائل قاطعہ اور براہین ساطعہ قرآنِ کریم سے پیش کئے گئے ہیں تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ورنہ قرآنِ کریم کی دیگر آیات سے بھی اس موقف کے حق میں استدلال کیا جا سکتا ہے۔ اگر پہلے سے ذہن میں وحی غیر متلو کا عقیدہ ذہن میں نہ بٹھایا جائے اور خالی الذہن ہو کر قرآنِ کریم کا مطالعہ کیا جائے تو کسی آیت سے بھی وحی غیر متلو کا خیال تک نہیں آ سکتا۔

وحی صرف قرآن میں ہونے کی عقلی دلیل

عقلاً بھی یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی کہ وحی قرآنِ کریم کے باہر بھی تھی۔ کیونکہ اگر قرآنِ کریم کے باہر بھی وحی تھی تو حضورؐ کا فرضِ منصبی تھا کہ وہ نہ صرف اس کی واضح طور پر نشاندہی فرماتے بلکہ اس کی حفاظت کی تلقین بھی فرماتے کیونکہ حضورؐ کا فرضِ اصلی ہی تبلیغِ وحی تھا قرآنِ کریم کو محفوظ کیا گیا۔ اس کی حفاظت کی

ذمہ داری خود خدا تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی۔ اگر وحی قرآن سے باہر بھی تو اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خدا تعالیٰ پر ہوتی اور اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ میں ذکر کے ساتھ اس کا بھی اندراج ہوتا لیکن صورت یہ ہوئی کہ حضورؐ کے اڑھائی سو سال بعد حدیث کی تدوین کی گئی اور مختلف آئمہ کرام نے اس کو جمع کیا۔ اگر حدیث وحی ہے اور وہ ان ائمہ حدیث کی کوششوں سے جمع کی گئی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نصف وحی تو خدا نے محفوظ رکھی اور باقی نصف وحی ان حضرات کی کوششوں سے محفوظ رہ سکی اور اس طرح یہ حضرات شریکِ کارِ رسالت قرار پائے۔ یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ وحی جیسی اہم چیز کو حضور دوسروں کی کوششوں پر چھوڑ جاتے۔ پھر احادیث جمع کرنے کے جو کوائف خود کتب حدیث میں مذکور ہیں اِن سے ظاہر ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تقریباً چھ لاکھ احادیث میں سے صرف چھ ہزار احادیث اپنی صحیح میں جمع فرمائی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وحی کے جمع استرداد کا حق امام صاحب موصوف نے استعمال فرمایا۔ معلوم نہیں امام صاحبؒ کے پاس وہ کونسا ذریعہ تھا جس کے سبب انہوں نے اتنی بڑی تعداد احادیث کی سترد فرمادی۔ آج کے مذعومہ منکرین حدیث تو چند ہزاری احادیث کے منکر ہیں۔ امام صاحب موصوف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اتنی بڑی تعداد احادیث کا انکار فرمایا اور منکرین حدیث کے الزام سے محفوظ رہے۔ یہ بات وحی کی توہین و استخفاف ہے کہ اس کے قبول و استرداد کا حق کسی بھی فرد کو دیا جائے خواہ وہ کتنی ہی بڑی شخصیت کیوں نہ ہو۔

وحی خارج از قرآن کا اقرار بھی اور انکار بھی

یہ عجیب بات ہے کہ جملہ اہل اسلام کے مختلف فرق سب کے سب موجود ذخیرۂ احادیث کا اقرار بھی کرتے ہیں اور انکار بھی کرتے ہیں یہ اس سے کہ مسلمانوں میں جتنے فرقے بھی ہیں ان میں اہلِ تشیع و اہلِ تسنن کی تو احادیث کی کتب

ہی مختلف ہیں۔ شیعہ حضرات کی کتب اربعہ ہیں اور اہلسنت کی صحاح ستہ۔ اس طرح ایک طرف چھ صحاح صحیح اور چار کتب غلط ہیں اور دوسری طرف چار صحیح اور چھ غلط ہیں اور عملاً یہ پوزیشن ہے کہ سنی شیعوں کی کتب کا انکار کرتے ہیں اور شیعہ سنیوں کی کتب کی تغلیط کرتے ہیں۔ اس طرح دونوں طرف اقرار بھی ہے اور انکار بھی۔ اسی طرح اہلِ حدیث حضرات فاتحہ خلف الامام۔ رفع یدین۔ رفع سبابہ آمین بالجہر کی احادیث کو درست قرار دیتے ہیں۔ مگر اہلِ تقلید حضرات ان احادیث کا انکار کرتے ہیں۔ حنفی حضرات میں بھی بریلوی حضرات ایصالِ ثواب۔ سماعِ موتیٰ۔ استمداد غیر اللہ کو SUPPORT کرنے والی احادیث کو درست خیال کرتے ہیں اور دیوبندی حضرات ان کو غلط شمار کرتے ہیں۔ غرض پورے مسلمانوں میں یہی صورتِ حال ہے کہ اقرار بھی ہے اور انکار ہے۔ وحی الٰہی اس سطح سے بلند ہوتی ہے۔ اس پر ایمان لانا لازمی ہوتا ہے اس پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مومن یا مسلمان نہیں ہو سکتا۔ وحی الٰہی ان اعتراضات سے بلند و بالا ہوتی ہے اور اس میں ظن و شک کا شائبہ تک نہیں پایا جا سکتا کیونکہ اگر ذرا بھی تشکیک و ظن کا پہلو موجود ہو تو اس پر ایمان مستحکم و مضبوط ہو ہی نہیں سکتا۔ وَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ؕ

حضورؐ کا ہر قول وحی نہیں تھا

علماء کرام کی طرف سے جو دلائل وحی خارج از قرآن کے سلسلہ میں پیش کئے جاتے ہیں ان میں سرِ فہرست یہ اعتراض ہے کہ چونکہ نطقِ رسولؐ وحی ہے۔ اس لئے حضورؐ کا ہر قول وحی ہے۔ لہٰذا حضورؐ کی احادیث وحی ہیں۔ اس نظریہ کی تائید میں آیہ کریمہ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ الخ ہر موقعہ پر پیش کی جاتی ہے۔ چنانچہ علامہ محمد ایوب صاحب نے اپنی کتاب "فتنۂ انکارِ حدیث" میں تحریر فرمایا ہے "بے شمار دلیلیں موجود ہیں۔ قرآن کے علاوہ دوسری وحی پر "مَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ۔ وہ اپنی

خواہش سے نہیں بولتا اس کا نطق صرف وحی ہے۔ اب اگر کوئی کہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صرف قرآن اپنی خواہش سے نہیں بولتا تو یہ غلط ہے۔ اس لئے کہ قرآن کو آیت میں محذوف ماننا پڑے گا اور حذف خلافِ اصل ہے۔ دوسرے ہُوَ کی ضمیر کا مرجع اوپر مذکور نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ وہ سیدھے راستے سے رکا اور نہ ٹیڑھا چلا۔ عمل کی صفائی مَاضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی سے کر دی اور قول کی صفائی مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی سے کر دی یعنی اس کا قول و فعل منجانب اللہ ہے اس کے علاوہ معنیٰ آیت کے یہ ہیں کہ مطلقاً نطقِ ہوائی کی نفی ہے۔ لہٰذا اس کا ہر قول غیر ہوائی اور وحی ہے۔

عموماً یہی دلیل سرفہرست ہوتی ہے لیکن یہ اعتراض آیتِ مبارکہ کا صحیح مفہوم معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ حضورؐ کے ہر نطق کے وحی ہونے کے خلاف خود قرآن اور روایات میں دلائل موجود ہیں۔ قرآن کریم میں ہے کہ ایک لڑائی میں حضورؐ نے منافقوں کو شرکت نہ کرنے کی اجازت عنایت فرمادی تھی تو اسی پر یہ آیت لِمَ اَذِنْتَ لَھُمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْکٰذِبِیْنَ نازل ہوئی کہ آپ نے انہیں اجازت کیوں دے دی۔ یعنی خدا تعالیٰ نے حضورؐ کے قول کو APPROVE نہیں فرمایا۔ اب اگر آپ کا اجازت دینا وحی الٰہی سے تھا تو پھر خدا تعالیٰ نے خود اجازت دلوانے کے بعد حضورؐ کے اس قول کی تصویب کیوں نہیں فرمائی۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپ کا اجازت دینا وحی نہیں تھا بلکہ یہ آپ کا اپنا بشری قول تھا۔

اسی طرح سورہ مجادلہ کی پہلی آیت کریمہ کے ذیل میں تمام مفسرین نے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت خولہ رضی اللہ عنہا کو ان کے شوہر حضرت اوس بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ظہار کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد انہیں جب خواہش ہوئی تو ظہار کے متعلق صحیح پوزیشن حاصل کرنے کا تردد ہوا۔ اس پر حضرت خولہ بنت ثعلب حضورؐ کے پاس آئیں اور اصرار کیا کہ ظہار سے طلاق واقع نہیں ہوئی۔ مگر حضورؐ بار بار یہی فرماتے رہے کہ ظہار کرنے کی وجہ سے طلاق

ہوگئی۔ چنانچہ حضرت خولہ حضورؐ سے اس بات پر جھگڑتی رہیں مگر حضورؐ کہ جن کی ہر بات علماء کے نزدیک وحی تھی بار بار یہی فرماتے رہے کہ نہیں تمہیں طلاق ہوئی۔ مگر فوراً وحی میں یہ دو آیات نازل ہوئیں اور اس قرآنی وحی کے ذریعہ حضورؐ نے اپنی غیر قرآنی وحی یا وحی خفی کو مسترد کردیا۔ سَمِعَ اللّٰہُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُکَ فِیْ زَوْجِہَا وَ تَشْتَکِیْ اِلَی اللّٰہِ۔ کیا یہ خدا تعالیٰ کو زیب دیتا ہے کہ اس کی ایک وحی دوسری وحی کی تردید کردے

می نسزد خدائے را

سورہ تحریم کی پہلی آیتِ مبارکہ کے متعلق روایات میں بہت تفصیل سے کام لیا گیا ہے جس کا مکمل تحریر کرنا مشکل ہے۔ اس کا ملخص یہ ہے کہ حضورؐ نے اپنی ازواجِ مطہرات کی خوشنودی کی خاطر اپنے لئے مغافیر حرام قرار دے دیئے گئے تھے۔ چنانچہ آیتِ کریمہ یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ الخ نازل ہوئی جس میں حضور کے اس فعل کو مناسب قرار نہیں دیا گیا کہ آپ نے اپنی ازواج کی خوشنودی کیلئے وہ چیز کیوں حرام قرار دے لی جو اللہ نے آپ کے لئے حلال کی تھی۔ اس طرح پہلے تو اللہ تعالیٰ نے وحی خفی کے ذریعے حضور سے ان کی ازواج کی خوشنودی کی خاطر آپ پر شہد حرام کرادیا پھر خود ہی وحی جلی کے ذریعہ اسی قول کو ناپسند فرمادیا۔

نیز پہلے تو واقعہ اصحاب کہف کے متعلق سوال کرنے والوں کے جواب میں حضورؐ سے خود ہی بذریعہ وحی خفی کہلایا کہ میں اس کا جواب کل دوں گا اور اس کے بعد ہی آیتِ کریمہ وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا نازل فرماکر وحی جلی سے وحی خفی کی تردید کرادی۔

اختصار کے پیشِ نظر میں نے یہ چار آیاتِ کریمات مع شانِ نزول و تراجم مرقوم کی ہیں جس سے ثابت کرنا ہے کہ حضور کا ہر قول وحی نہیں ہوتا تھا۔ اگر آنجناب کا ہر قول وحی تھا تو حضور کے ان اقوال میں تخالف و تضاد واقع نہ ہوتا۔ صحیح صورتِ حال یہی ہے

کہ حضورؐ کے بشری اقوال ہوتے تھے۔ آپ بشر صاحب وحی تھے (۱۸/۱۱۰، ۴۱/۶)
نیز یہ کہ آپ بشر و رسول تھے۔ ۱۷/۹۲۔ یعنی آپ بشر بھی تھے اور رسول بھی تھے۔ اس
لئے آپ کے بشری اقوال وحی نہیں تھے۔ مثلاً آپ فرماتے کہ آج موسم بہت گرم ہے
میں آج بازار نہیں جاؤں گا۔ یا آپ فرماتے کہ میں آج دوپہر کا وقت مسجد میں گزاروں گا
وغیرہ۔ اقوال وحی الٰہی نہیں تھے۔ یہ حضورؐ کے بشری اقوال تھے اور ان کو وحی قرار دینے
کے معنے یہ ہیں کہ وحی کی اہمیت، اس کی عظمت اور اس کے شرف کا صحیح اندازہ نہیں کیا گیا۔

(از خواجہ ازہر عباس از رسالہ ادارہ تبلیغ القرآن صفحہ ۳ تا ۱۵)

ایک اور مقالے میں لکھتے ہیں کہ وحی خفی کا نظریہ مختلف فرقوں کے وجود کا باعث بنا۔ چنانچہ لکھا ہے:

" یَآاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ (۶۰/۱)

اے مسلمانو! تم میرے اور اپنے دشمن کو کبھی دوست نہ بنانا

نیز فرمایا

وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْھِبُوْنَ
بِہٖ عَدُوَّ اللّٰہِ وَعَدُوَّکُمْ وَاٰخَرِیْنَ مِنْ دُوْنِھِمْ (۸/۶۰)

اور (مسلمانو) ان کفار کے (مقابلہ کے) واسطے ۰ جہاں تک تم سے ہو سکے
اپنے بازو کے) زور سے اور بندھے ہوئے گھوڑوں سے (لڑائی) کا سامان مہیا
کرو۔ اس سے خدا کے دشمن اور اپنے دشمن اور اس کے سوا اور دوسرے لوگوں پر بھی
اپنا رعب جما لوگے اپنے دشمن کو ہر شخص جانتا ہے۔ لیکن ان آیات میں اور ان کے
علاوہ اور بھی چند مقامات پر خدا تعالے نے اپنے دشمن کا ذکر فرمایا ہے جو خدا اور
مسلمانوں کا مشترک دشمن ہے۔ خدا اور مسلمانوں کا مشترک دشمن کون ہو سکتا ہے۔
صرف وہ جو دینِ خداوندی کا دشمن ہو۔ وہ خدا اور مسلمانوں کا مشترک دشمن ہے۔ کیونکہ
مسلمانوں کی تو ہستی ہی دینِ خداوندی کے ساتھ منسلک ہے۔ اگر اس کے دین کو قوت

اور استقامت ہے تو مسلمانوں کو بھی غلبہ حاصل ہے۔ اگر اس کے دین کو غلبہ نہیں ہے تو مسلمانوں کی بھی عزت و قدر نہیں ہے۔ یہ تھا وہ دین جسے حضورؐ نے نہ صرف دنیا کے سامنے پیش کیا بلکہ اسے متشکل کر کے بھی دکھا دیا۔ حضور اس دین کو لوگوں کے سامنے پیش فرماتے تھے۔ اس کی غایت اور حکمت کو دلائل اور براہین سے سمجھاتے تھے۔ مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیتے تھے انہیں غور و فکر کی دعوت دیتے تھے۔ جو اس طرح پورے اطمینانِ قلب سے اس کو قبول کرتا تھا۔ اسے اپنی جماعت میں شامل فرماتے تھے۔ یہ تھی جماعتِ مومنین جنہوں نے دین کا معاشرہ قائم کیا تھا۔

دین کا قیام اور اس کا تمکن نتیجہ اور ثمرہ ہوتا ہے وحی کے صحیح اتباع کا۔ حضور نے خود وحی کا اتباع فرمایا اور اپنے مومنین ساتھیوں سے بھی اس پر عمل کرایا۔ صحیح معنی میں خدا اور مسلمانوں کے دشمن وہ ہیں جو اس کی تعلیم یعنی وحی کو صحیح صورت میں سامنے نہ آنے دیں۔ اور اسے ہر طرح سے لوگوں تک پہنچنے سے روکیں۔ حضورؐ کے عہد شریف میں بھی یہی حال تھا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ (۲۶/۴۱)

ترجمہ اور کفار کہنے لگے کہ اس قرآن کو سنو ہی نہیں اور جب پڑھیں تو اس (کے بیچ) میں غل مچایا کرو

لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ تاکہ (اس ترکیب سے) تم غالب آجاؤ۔

حضور کے دورِ ہمایوں کے بعد بھی یہی صورت رہی کوشش یہی کی گئی کہ کسی طرح نہ تو اس کی صحیح تعلیم سامنے آئے اور نہ اس پر عمل درآمد کیا جا سکے۔ اس کے لئے مختلف نظریات قائم کئے گئے کہ

۱۔ قرآن کے اصل معانی وہ نہیں جو اس کے الفاظ سے لئے جاتے ہیں بلکہ اصل معنی اس کے باطنی معنی ہوتے ہیں۔

۲۔ قرآن کے الفاظ اوراد و وظائف کیلئے ہیں اور ان کے دوہرانے سے

عجیب نتائج نکلتے ہیں

۳۔ قرآن کی آیات ایک دوسرے کو منسوخ کرتی ہیں۔ بایں طور کہ یہ حتمی طور پر معلوم نہیں کہ کس آیت نے کس آیت کو منسوخ کیا ہے۔

۴۔ آیاتِ قرآنی کی غیر قرآنی تفسیر پیش کی گئی اور اسے حضور کی طرف منسوب کیا گیا۔

۵۔ جو کچھ حضور فرماتے تھے وہ ان کی اپنی طرف سے نہیں تھا بلکہ یہ بھی خدا کی طرف سے وحی ہوتا تھا۔ یعنی یہ وحی قرآن سے الگ ایک اور وحی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر قسم کے عقائد وضع کرنے کے بعد ان کو JUSTIFY کرنے کا دروازہ کھل گیا اور متعین طور پر یہ بات طے ہی نہیں ہو سکتی کہ کونسا نظریہ وحی کیمطابق ہے اور کونسا نہیں۔ کیونکہ اگر وحی صرف قرآن میں ہی سمجھی جاتی تو ہر نظریہ کی صحت و سقم معلوم کی جاسکتی تھی۔ لیکن قرآن کے علاوہ بھی وحی تسلیم کی جائے تو کوئی صورت نظریات کی تردید یا تصویب کی باقی نہیں رہتی۔ اسی وجہ سے آج بیشتر نظریات کے متعلق حتمی طور پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا اور اسی وجہ سے مسلمانوں میں متعدد فرقوں کا وجود قرار و استقلال پکڑ گیا۔

(مقالہ از خواجہ ازہر عباس شائع کردہ ایوانِ قرآن مقالہ دوم صہ ۱۳ تا ۱۵)

اسی سلسلے میں اپنے ایک مقالہ بعنوان "فہمِ قرآن" علامہ اسلم جیراجپوری صاحب نے کسی کے جواب میں تحریر فرمایا جو نذرِ قارئین ہے۔

فہمِ قرآن

قرآن کریم مکمل اور کامل کتاب ہے اور اس قدر واضح اور روشن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا نام ہی "نور مبین" رکھا ہے۔

وَاَنزَلنَا اِلَیکُم نُورًا مُّبِینًا (۴/۱۷۴)

اور ہم نے جگمگاتا نور تمہاری طرف اتارا

نور خود بھی روشن ہوتا ہے اور ارد گرد کی چیزوں کو بھی روشن کر دیتا ہے۔ یہی حال قرآن کا ہے کہ وہ واضح کھلا ہوا اور روشن ہے اور اپنی تشریح آپ ہے اس کی تلاش کے لئے کسی روشنی کی ضرورت نہیں جس طرح آفتاب کو چراغ سے نہیں ڈھونڈا جاتا۔ وہ دین و دنیا کے ان جملہ حقائق کی جن سے انسان کو ہدایت ملے اور قدیم آسمانی کتابوں کی جملہ تعلیمات کی توضیح اور تفصیل اپنے اندر رکھتا ہے۔

وَنَزَّلنَا عَلَیکَ الکِتَابَ تِبیَانًا لِّکُلِّ شَیءٍ وَّهُدًی وَّرَحمَةً وَّبُشرٰی لِلمُسلِمِینَ (۱۶/۸۹)

اور ہم نے تجھ پر کتاب اتاری جو ہر شے کی تشریح اور مسلمانوں کے لئے ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے۔

مَا کَانَ حَدِیثًا یُّفتَرٰی وَلٰکِن تَصدِیقَ الَّذِی بَینَ یَدَیهِ وَتَفصِیلَ کُلِّ شَیءٍ وَّهُدًی وَّرَحمَةً لِّقَومٍ یُّؤمِنُونَ ۱۲/۱۱۱

یہ قرآن کوئی بنائی ہوئی بات نہیں ہے بلکہ اس میں پہلی کتابوں کی تصدیق اور ہر شے کی تفصیل ہے اور ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے ہیں ہدایت اور رحمت ہے۔

حسب ذیل آیتیں ہیں۔

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (سورہ یونس رکوع۴)

اور ان میں اکثر صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں اور ظن تو حق کی جگہ کچھ بھی کارآمد نہیں۔

قل هل عندكم من علم فتخرجوه لنا ان تتبعون الا الظن وان انتم الا تخرصون۔ (پارہ ہشتم رکوع ۵)

پوچھ کہ کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے تو اس کو ہمارے لیئے نکالو۔ تم صرف ظن کی پیروی کرتے ہو اور بس اٹکل دوڑاتے ہو۔

وان تطع اكثر من فى الارض يضلوك عن سبيل الله ان يتبعون الا الظن وان هم الا يخرصون (پارہ ہشتم رکوع)

اور روئے زمین کے اکثر (لوگ ایسے) کہ ان کی جو تم اطاعت کروگے وہ تم کو اللہ کی راہ سے گم کردیں گے وہ تو صرف ظن کے پیرو ہیں اور بس اندازے لگاتے ہیں

ان کے علاوہ اور بہت سی آئتیں پیش کی جاسکتی ہیں، جن میں ظن کی پیروی کو نہ صرف ممنوع کہا ہے بلکہ گمراہی کا موجب بتایا ہے۔ قرآن یقین سے کم کی پیروی کا مطلق روادار نہیں ہے

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل رکوع۴)

اس کے پیچھے نہ چل جس کے نتیجہ کو علم (یقین) نہیں۔ کیونکہ سمع البصر اور قلب ہر ایک سے اس کی بابت سوال ہوگا۔

اہل سنت کے قریب حدیث کی چھ کتابیں ہیں جو صحاح ستہ بولی جاتی ہیں۔ مقبول ہیں ان کے مؤلفین کے وفاتوں کے سنین یہ ہیں۔ امام بخاری ۲۵۶ھ۔

امام مسلم ۲۶۱ھ۔ ابنِ ماجہ ۲۷۳ھ، ابو داؤد ۲۷۵ھ، ترمذی ۲۷۹ھ، النسائی ۳۰۳ھ یعنی یہ سب تیسری صدی ہجری کے آخر کے لوگ ہیں۔ ان میں جو روایتیں ہیں وہ بالعموم پانچ یا چھ یا کبھی اس سے بھی زیادہ یا کبھی اس سے بھی کم راویوں کے توسط سے آتی ہیں۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے سُنا زید سے۔ اس نے سنا تھا عمرو سے۔ اس سے بیان کیا تھا بکر نے اس کو خبر دی تھی خالد نے۔ اس سے کہا تھا اصغر نے، اس نے سنا تھا اصغر سے! خبر در خبر، در خبر، در خبر جو نہ علم ہے نہ شہادت ہے۔

ایسی النسائی روایت در روایت، در روایت، در روایت، در روایت پر جس دین کی بنیاد ہوگی وہ تو بہت کمزور ہوگا یہ مانا کہ لوگ بیان کرتے ہیں کہ یہ رواۃ ثقہ تھے، لیکن باوجود اس کے غلطی۔ غلط فہمی خطا ونسیان سے بَری نہ تھے۔ پھر ان کی روایات کی ضمانت کیا ہوئی؟ قیامت کے دن اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کچھ حدیثوں کے متعلق کہہ دیا کہ میں نے ان کو نہیں بیان کیا تھا یا میرے کہنے کا یہ مطلب نہ تھا یا یہ میرے الفاظ نہیں تو اس وقت کیا جواب ہوگا۔ الغرض حدیث کی حمایت کا جو جوش آپ نے دکھایا ہے وہ اس وجہ سے کہ أباً عن جدٍ اس کے خوگر چلے آتے ہیں، حقیقت فہمی کی بنیاد پر نہیں ہے۔ یہ وہی جذبہ ہے جس کو قرآن نے بار بار کہا ہے:۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا (لقمان رکوع ۳)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس پر چلو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اسی پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے بزرگوں کو پایا ہے۔

علمی دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ نے جہاں اپنے طویل وعریض مضمون اپنے رسالہ میں چھاپا ہے۔ یہ میرا مختصر عریضہ اس میں شائع فرما دیں۔ حاشیہ میں آپ کو اختیار

ہے جو کچھ چاہیں لکھیں لیکن قرآن کی اس آیت کو پیش نظر رکھیں اور ضمیر کو دھوکہ نہ دیں۔

بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ ولو القی معاذیرہ ۔(قیامہ رکوع ۱جز۲۹)

انسان اپنے نفس کو دیکھ رہا ہے گو وہ اپنے عذرات پیش کرتا ہے۔

حدیثوں کو آپ دین مانتے ہیں تو مانئے لیکن ان کو غیر یقینی مانتے ہوئے دینی حجت رکھ کر وہ بنائی جاتی ہیں۔ یہی کیفیت خالق اور مخلوق کے کلام کے مراتب کی ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے وہ کسی ایک ماحول، ایک زبان یا ایک مکان کے لئے نہیں ہے، بلکہ ہر ماحول ہر زبان اور ہر مکان میں انسان کا اشیائے فطرت کے متعلق جس قدر علم بڑھتا جائے گا اسی قدر قرآنی حقائق بھی اس کی سمجھ میں آتے جائیں گے اور قرآن بھی فطری اشیاء کی طرح کسی زمانہ میں ختم ہو جانے والا اور تھکنے والا نہیں ہے۔ بخلاف انسانی اقوال کے کہ ان کے معانی محدود ہوتے ہیں۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عہد صحابہؓ میں قرآن بالکل سمجھ لیا گیا اور اب ہم کو انہیں کی فہم پر قناعت کرنا چاہیئے۔ وہ قرآن کی حقیقت سے آشنا نہیں ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا علم قرآن دیگر علماء قرآن سے اس لحاظ سے افضل ہے کہ انہوں نے اس کے عملی پہلو کو اختیار کیا اور جو کچھ سمجھایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سمجھایا۔ اس کی حرف بحرف تعمیل کی اور حقیقت یہ ہے کہ قرآن صرف نظری کتاب نہیں ہے بلکہ عملی بھی ہے اور اس کی ہدایات پر عمل کرنے سے ہی فلاح نصیب ہوتی ہے۔ اس لئے صحابہؓ کا درجہ عملی لحاظ سے اس قدر افضل ہے کہ ساری امت مل کر بھی ان کے رتبہ کو نہیں پہنچ سکتی۔ لیکن جو لوگ فہم قرآن کو ان روایات میں الجھانا چاہتے ہیں جو صحابہؓ کرام سے مروی ہیں وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ قرآن کسی ایک ماحول کی کتاب نہیں ہے۔ اگر کسی زمانہ میں وہ بالکل سمجھ لیا گیا

تو بس ختم ہو گیا اور آئندہ کیلئے نصاب نہیں رہا۔ لیکن وہ قیامت تک کیلئے نصاب ہے اور ہر زمانہ میں نئی روشنی ہدایت کے لئے اس سے نکالی جا سکتی ہے۔ علاوہ بریں یہ روایات جن ذرائع سے آئی ہیں وہ اس قدر غیر یقینی اور مشتبہ ہیں کہ ان پر قرآن جیسی قطعی اور یقینی چیز کا مدار رکھنا اس کی قطعیت کو کھونا ہے۔

یہ خیال بھی کہ اس زمانہ میں جب آیات نازل ہوئی تھیں۔ لوگ ان کے شانِ نزول سے واقف تھے اس لئے انہوں نے اچھی طرح ان کو سمجھ لیا۔ دراصل قرآن کے متعلق اسی غلط تصور کا نتیجہ ہے کہ وہ ایک ہی زمانہ کی چیز ہے۔ قرآن کسی شانِ نزول، موقع نزول یا واقع نزول کا پابند نہیں ہے اور اس کی ہدایات مخصوص زمان و مکان سے وابستہ نہیں ہیں بلکہ بالاتر ہیں۔

ہماری تمام تفسیریں آغازِ عہد سے اب تک امام ابن جریر طبری سے مفتی محمد عبدہ تک اسی قدامت پرستی کے نظریہ کے ماتحت لکھی گئی ہیں اور ان کا انداز بھی شروع سے آج تک ایک ہی ہے یعنی وہ سلسلہ بہ سلسلہ آیات کے ساتھ چلتی ہیں۔ اس طرح آیات اور الفاظ کی تو ضرور تشریح ہو جاتی ہے۔ مگر قرآنی مسائل اور حقائق سمجھ میں نہیں آتے کیونکہ وہ مسلسل نہیں بیان کئے گئے بلکہ مختلف سورتوں اور آیتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لئے قرآن فہمی کے لئے یہ تفسیریں زیادہ کارآمد نہیں ہیں۔ ان تمام تفسیروں کا جو مفید حصہ ہو سکتا ہے وہ تقریباً اسی قدر ہے جس کو راغب اصفہانی نے اپنی کتاب مفردات میں جمع کر دیا ہے۔ بقیہ جو کچھ ہے وہ سلف کی آیات فہمی کی تاریخ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم اپنی شرح آپ ہے۔ اس کی تفسیر اللہ نے اپنے ذمے لی ہے۔

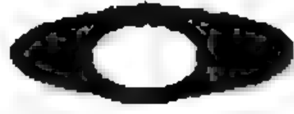
ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ

پھر اس کی تشریح بھی ہمارے ذمہ ہے

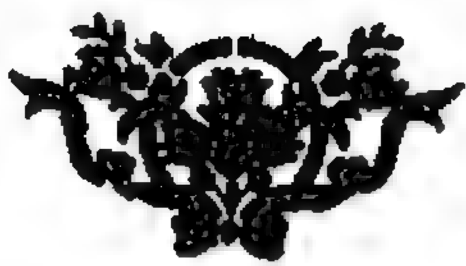
آیاتِ قرآنی بیشتر محکم ہیں۔ یعنی ان کے معنی قطعی اور متعین ہیں۔ تھوڑی سی متشبہات ہیں۔ جن کے حقائق انسان کی علمی دسترس سے بالاتر ہیں۔ مثلاً اللہ کی ذات، صفات، جنت، دوزخ اور میزانِ عمل وغیرہ جن کو تمثیل اور تشبیہہ کے طور پر قرآن نے بیان کیا ہے اور جن کی اصل حقیقت سمجھنے سے انسان اس دنیا میں قاصر ہے۔

محکم آیات جو ام الکتاب اور اصل قرآن کہی گئی ہیں اس کی تفصیلات اللہ ہی کی طرف سے کی گئی ہیں۔

كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝



از علامہ اسلم جیراجپوری، ادارہ تبلیغ القرآن
پوسٹ بکس نمبر ۶۲۲، لاہور صفحہ نمبر ۳ تا ۷



حدیث میں تحریف

ڈاکٹر غلام جیلانی برق صاحب بعنوان "حدیث میں تحریف" رقمطراز ہیں:

○ جب پہاڑ کے دامن سے کوئی چشمہ پھوٹتا ہے تو اس کا پانی صاف شفاف ہوتا ہے۔ لیکن جوں جوں وہ میدانوں کی طرف بڑھتا ہے، خس و خاشاک اور خاک و غبار کی وجہ سے گدلا ہوتا جاتا ہے۔ یہی حال مذہب کا ہے۔ آج سے ۱۳۶۸ برس پہلے اسلام کا چشمہ دامن فاران سے چھوٹا اور کئی دھاروں میں بٹ کر مشرق و مغرب کی طرف بڑھا۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں مختلف الانواع کثافتیں شامل ہوتی گئیں۔ کہیں عیسائیوں کی رہبانیت اس میں آملی اور کہیں آریوں کا نظریہ حلول و وحدت الوجود۔ راہ میں کہیں تصوف کی دلدلیں آگئیں اور کہیں کلامِ اعتزال کے خاکستان۔ ان مختلف گزرگاہوں سے ہوتا اور اس طویل راہگذر کی آلودگیوں کو سمیٹتا ہوا جب یہ چشمہ ہم تک پہنچا تو ہم فیصلہ نہ کر سکے کہ یہ الہامی بلندیوں کا مقطر آب تھا یا کسی بدرو کا مکدر پانی۔ اہلِ نظر لرزے اور متلاشیانِ حق بے تابانہ منبع کی طرف بڑھے تاکہ ان مقامات کا کھوج لگائیں جہاں سے کثافت اس چشمے میں شامل ہو رہی تھی۔ سفر لمبا تھا، منزل کٹھن، راہبر ناپید، خانہ ساز عقائد کی گھٹائیں محیط اور راہ تاریک ماحول میں گم۔

ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ (ظلمات تہ بہ تہ)

بیسیوں جی ہار کر بیٹھ گئے اور کچھ ان ستاروں کی مدھم روشنی میں آگے بڑھتے گئے جو گھٹاؤں کی چلمن سے ان راہ نوردوں کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ جوں جوں وہ بڑھتے گئے، گھٹائیں چھٹتی گئیں، ظلمت سرکتی گئی، پردے اٹھتے گئے۔ یہاں تک

کہ وہ ایسے خطوں میں جا پہنچے جہاں آفتاب الہام کی تجلیوں سے نگاہیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں اور دل و دماغ منوّر۔ ہر حقیقت وہاں عیاں تھی۔ اور ہر راز بے حجاب۔ انہوں نے ملت کو بلند آواز سے پکارا اور کچھ کہا۔ یہ آواز چند کانوں سے ٹکرائی اور پھر گونج بن کر دشت کی پہنائیوں میں گم ہو گئی۔

جانتے ہو انہوں نے کیا کہا تھا؟ یہی کہ ہمارے شکم پرست اور خود بین ساحروں نے حرمِ حقیقت میں سینکڑوں بُت بنا رکھے ہیں۔ جن میں ایک کا نام "وضعی احادیث" ہے۔ یعنی وہ اقوال جو لوگوں نے تراش کر حضور صلعم کی طرف منسوب کر دیئے تھے اور آج وہ اقوال رسولؐ کے ساتھ ایسے خلط ملط ہو چکے ہیں کہ حق کو باطل سے علیحدہ کرنا ناممکن ہو رہا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ ہمارے بعض علماء نے سچ کو جھوٹ سے علیحدہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ راویوں کا سراغ لگایا۔ ان کے حالات جمع کیے۔ اندازہ بہت تحقیق کی۔ لیکن معاملہ اس قدر الجھ چکا تھا کہ اسے سلجھانا انسانی دسترس سے باہر تھا۔ وہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ علم کم تھا۔ لکھنے والے محدود اور ذخائرِ علم معدوم۔ صحابہ کی تمام تر توجہ قیامِ سلطنت، نشرِ اسلام اور تعمیرِ ملت پہ صرف ہو رہی تھی ان کے پاس خود رسولؐ موجود تھے اور رسول کے بعد آپ کا دیا ہوا مکمل دائم ضابطہ حیات یعنی قرآن ——

انہیں کیا خبر تھی کہ ڈیڑھ سو سال بعد لوگ قرآن کو چھوڑ کر احادیث پہ جھک پڑیں گے۔ احادیث کا ذخیرہ بڑھتے بڑھتے چودہ لاکھ تک پہنچ جائے گا۔ ہزارہا اہلِ غرض لاکھوں احادیث گھڑ کر اس مقدس ذخیرے میں شامل کر دیں گے اور اس وقت مسلمانوں کو صحیح و غلط میں امتیاز کی ضرورت پیش آئے گی۔ اگر انہیں یہ معلوم ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال جمع کر جاتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا۔ ان کی بڑی بڑی وجوہ دو تھیں۔

اوّل وہ قرآن کی موجودگی میں کسی اور کتاب کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے تھے۔ صیحح بخاری میں مذکور ہے کہ جب رحلت سے پہلے حضور نے فرمایا کہ

اِیْتُوْنِیْ بِکِتَابٍ وَّ قِرْطَاسٍ اَکْتُبُ لَکُمْ شَیْئًا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ "لاؤ قلم دوات اور کاغذ میں تمہیں ایک ایسی چیز لکھ کر دے جاؤں کہ میرے بعد تمہاری گمراہی کا کوئی امکان باقی نہ رہے"

تو حضرت عمر رضی بن خطاب جھٹ بول اٹھے ہمیں کسی مزید تحریر کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ

حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ

ہمارے پاس کتاب الٰہی موجود ہے۔ جس میں انسانی فلاح و نجات کے مکمل گر درج ہیں۔ اور یہ کتاب ہمارے لئے کافی ہے۔ حضرت فاروق کا یہ جملہ رسالت پناہ کے حضور میں جسارت معلوم ہوتا ہے۔ لیکن وہ مجبور تھے، اس لئے کہ کچھ عرصہ پیشتر قرآن کی یہ آیت نازل ہو چکی تھی۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ "آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تمہیں پوری طرح عطا کر دی ہے"

اس آیت کی رُو سے نسلِ انسانی کی یہ کتاب ہر طرح مکمل اور پوری ہو چکی تھی۔ اس آیت کے ہوتے ہوئے کسی مزید ہدایت کا انتظار بے کار تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کے ایمان کا امتحان لے رہے ہوں۔ اس لئے حضرت فاروق کا یہ جواب نہایت برمحل معلوم ہوتا ہے۔ دوم حضورؐ نے حدیث لکھنے سے روک دیا تھا۔

عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی شیئًا غیر القرآن فلیمحہ (صیحح مسلم)

"ابی سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قرآن کے بغیر میرا کوئی اور قول قلم بند نہ کرو اور اگر کوئی شخص ایسا قول لکھ چکا ہو تو اسے مٹا دے"

اور اس کی دو وجہیں تھیں :

اول : کہ کہیں غلطی سے احادیث قرآن کے متن میں شامل نہ ہو جائیں۔ بعض گذشتہ انبیاء کے الہامی صحائف میں ان کی احادیث بھی شامل ہو گئیں تھیں اور کتاب الٰہی کا حلیہ بگڑ گیا تھا۔

دوم :۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ان کے اقوال محرف ہو چکے تھے۔ اور یہ ہے بھی ایک فطری چیز۔ آدمی کو اپنی کہی ہوئی بات تک یاد نہیں رہتی، وہ دوسرے کی کیا یاد رکھ سکتا ہے۔ فرض کرو کہ ایک محفل میں چھ آدمی گھنٹہ بھر گفتگو کرتے رہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اختتام مجلس پر تمام گفتگو بالفاظ دہرا سکیں؟ ناممکن ہے۔ اسی طرح فرض کرو کہ ایک واقعے کو پچاس آدمی دیکھتے ہیں۔ اگر آپ ان کے پاس علیحدہ علیحدہ جا کر اس واقعے کی تفصیل قلمبند کریں تو آپ کو ان تفاصیل میں کافی اختلافات نظر آئیں گے۔ اور اگر چھ ماہ یا سال بعد انہی لوگوں کے پاس جا کر اسی واقعے کی تفصیل دوبارہ قلمبند کریں تو یہ اختلاف اور نمایاں ہوگا اور مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ تفاصیل یوں بدلتی جائیں گی کہ ان کا تعلق حقیقت سے منقطع ہو جائے گا۔

حضور علیہ السلام انسان کی اس فطری کمزوری سے آگاہ تھے۔ اس لئے آپ نے حکم دے دیا تھا کہ میری حدیث قید کتابت میں مت لاؤ۔ ممکن ہے کہ آپ یہ کہیں کہ انسان اپنے یا اپنے ساتھی کی بات تو بھول سکتا ہے۔ لیکن وہ اپنے راہبر اور محبوب پیمبر کی بات نہیں بھول سکتا۔ میں عرض کروں گا کہ آپ یہاں بھی غلطی پر ہیں۔ آپ میں سے لاکھوں نے اپنے محبوب محترم لیڈر حضرت قائد اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ کی بیسیوں تقاریر سنی ہوں گی جنہیں بعد میں ریڈیو پاکستان نے بھی بار بار دہرایا۔ لیکن آپ میں سے کتنے ایسے ہیں جنہیں آج ان تقاریر کے تین فقرے بھی یاد ہوں۔ انسان ہے ہی فراموش کار۔ وہ سنتا ہے اور بھول جاتا ہے۔ آپ کو تاریخ کا یہ اہم واقعہ یاد

کہ حضرت فاروقؓ کے زمانے میں عراق کا قرآن حجاز سے مختلف ہو گیا تھا۔ کیوں؟ اس لئے نہیں کہ کوئی بدنیت تحریفِ قرآن پر تل گیا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ ان کے سامنے قرآن کا کوئی نسخہ موجود نہیں تھا۔ اس لئے بعض آیات حافظہ سے اتر گئیں اور بعض میں کچھ ردّ و بدل ہو گیا تھا۔ حضرت فاروقؓ نے اس کا علاج یوں کیا کہ قرآن کے کافی نسخے لکھوا کر قلمرو کے مختلف حصوں میں بھیج دیئے اور قرآن تحریف سے محفوظ ہو گیا۔ ابن حزم لکھتے ہیں کہ حضرت فاروق رضؓ کی رحلت کے وقت قرآن شریف کے ایک لاکھ نسخے تیار ہو چکے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ صحابہ کرام عشقِ خدا میں ڈوبے ہوئے تھے اور ان کا یہ محکم عقیدہ تھا کہ کسی آیت کو غلط پڑھنا اگر کفر نہیں تو فسق یقیناً ہے۔ اگر ان عاشقانِ خدا کو قرآن کی آیات بھول گئی تھیں تو حدیث کے بھولنے پر انہیں کون ملامت کر سکتا تھا۔

آنحضرت صلعم نے کتابت حدیث سے منع فرما دیا تھا۔ اور جو چیز لکھی نہ جائے وہ لازماً پہلے بگڑتی اور بالآخر مٹ جاتی ہے۔ حضورؐ کا مقصد بھی یہی تھا کہ قرآن حکیم کے بغیر کوئی اور کتاب ہدایت باقی نہ رہے۔ اس لئے کہ حضورؐ اور ان کے صحابہ قرآن کو ایک مکمل ضابطۂ حیات تصور فرماتے تھے اور اس کی موجودگی میں کسی اور کتاب کی قطعاً ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ ورنہ اگر صحابہؓ کو ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال آتا کہ قرآن کی تفصیل، تکمیل، تفسیر یا امت کی راہبری کے لئے حدیث کا زندہ رہنا ضروری ہے۔ تو ان کے لئے حدیث کی تدوین نہایت آسان تھی۔ جو عمر رضؓ قرآن کے ایک لاکھ نسخے لکھوا سکتا تھا۔ وہ پانچ چھ ہزار احادیث کا ایک مجموعہ بھی تیار کرا سکتا تھا۔ تمام صحابہؓ زندہ تھے۔ ان کی بیشتر تعداد مدینے میں موجود تھی اور بعض روایات کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمرو رضؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے پاس احادیث کی کافی تعداد لکھی ہوئی بھی تھی۔ راویوں کا لمبا چوڑا جھمیلا بھی نہیں تھا۔ ان حالات میں اگر

حضرت صدیقؓ یا فاروق رضؓ چاہتے تو صرف ایک مہینے میں سرورِ عالمؐ کے تمام اقوال جمع ہو سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا۔ کیوں؟ کیا انھیں اقوالِ رسولؐ سے معاندت تھی؟ عیاذاً باللہ! کیا انہیں اسلام سے محبت نہیں تھی؟ استغفراللہ۔ بات یہی تھی کہ اقوالِ رسولؐ میں تحریف ہو چکی تھی۔ نیز رسول اکرم صلعم کا حکم تھا کہ احادیث مت لکھو۔ مزید برآں انہیں اس حقیقت پر بھی محکم ایمان تھا کہ قرآن ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ اس لئے انہوں نے احادیث کو در خورِ اعتنا نہ سمجھا۔

علامہ ذہبی تذکرۃ الحفاظ ہیں۔ لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے پانچ سو احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ حضرت صدیق رضؓ کے مجموعے سے زیادہ قابلِ اعتماد اور کون سا مجموعہ ہو سکتا تھا۔ لیکن ایک صبح اسے اٹھ کر اسے جلا دیا۔

حضرت فاروقؓ کے متعلق مذکور ہے کہ آپ نے رسولِ اکرم صلعم کی احادیث اور آپ کا اسوہ لکھوانے کا ارادہ کیا۔ مہینے بھر استخارہ کرتے رہے اور پھر فرمایا:

کانوا قبلکم قوما اکتبوا کتبا فاکتبوا علیھا و ترکوا کتاب اللہ وانی واللہ لا اشوب کتاب اللہ بشیئ ابداً	تم سے پہلے ایسی قومیں گذر چکی ہیں جنھوں نے کتابیں لکھیں اور خدائی کتاب کو چھوڑ کر انہی پہ جھک پڑیں۔ خدا کی قسم میں قرآن میں ایسی آمیزش ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔

نامناسب نہ ہوگا اگر اس سلسلے میں چند اور تاریخی واقعات بھی بیان کر دیئے جائیں

۱۔ جب حضرت صدیق رضؓ مسندِ خلافت پر جلوہ آرا ہوئے تو آپ نے ایک دن ایک مجمع عام کو مخاطب کر کے فرمایا۔

• تم لوگ آج حدیث میں اختلاف رکھتے ہو (ہم یہی عرض کر رہے تھے کہ اقوالِ رسولؐ میں ردّ و بدل ہو چکا تھا اور وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ انہیں قلم بند کیا

جاتا)، آئندہ یہ اختلاف بڑھتا چلا جائے گا۔ اس لئے تم آنحضرتؐ سے کوئی حدیث روایت نہ کرو۔ اگر کوئی پوچھے تو کہو کہ ہمارے پاس قرآن موجود ہے۔ جو اس نے جائز قرار دیا ہے اسے جائز سمجھو"

(تذکرۃ الحفاظ ذہبی صہ۳)

۲۔ ایک مرتبہ حضرت فاروقؓ نے تمام صحابہ سے فرمایا کہ گھر جاؤ اور احادیث کا تمام ذخیرہ اٹھا لاؤ۔ جب یہ ذخیرہ جمع ہوگیا تو آپ نے تمام صحابہ کے سامنے اسے جلا دیا۔ (طبقات ابن سعد ج ۵ صہ۱۴۰)

ذرا سوچو کہ خلفائے راشدین کا زمانہ ہے۔ شمع نبوت پہ فدا ہونے والے ہزاروں پروانے موجود ہیں اور حضورؐ کے دو سب سے بڑے دوست اور فدائی آپ کے اقوال کا ذخیرہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر فناہ کر رہے ہیں۔ آخر کیوں؟ کیا انہیں ارشاداتِ رسولؐ سے ضد تھی؟ یا اقوالِ رسولؐ میں تحریف ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ پہلی وجہ غلط ہے اور دوسری صحیح۔ مقام حیرت ہے کہ جن احادیث کو مشتبہ یا ناقابلِ التفات سمجھ کر صدیق و فاروق رضی اللہ عنہم فنا کر رہے تھے۔ تاکہ اعمال و عقائد میں کوئی فتور پیدا نہ ہونے پائے۔ انہی احادیث کو اڑھائی سو سال بعد امام بخاریؒ اور مسلم وغیرہ نے جمع کیا اور ہم سب نے مل کر نعرہ لگایا۔

هذا اصح الكتب بعد كتاب الله

قرآن کے بعد صحیح بخاری صحیح ترین کتاب ہے۔

آخر کس طرح؟ چند ایک احادیث جو بعض صحابہ کے پاس تھیں۔ ان میں سے بیشتر جلا دی گئیں، جو زبانوں پر جاری تھیں۔ ان میں ہر لمحہ رد و بدل ہو رہا تھا۔ بات ایک دن میں کیا سے کیا ہو جاتی ہے اور ان اقوال پر تو اڑھائی سو برس گذر چکے تھے۔ وہ صحابہ جن کی دیانت اور سچائی پر بھروسا کیا جا سکتا تھا، فوت ہو چکے

تھے اور بعد میں آ گئے تھے ہم جیسے لوگ۔ امام حسینؓ کے قاتل، حضرت علیؓ کے باغی، کعبے کو ڈھا لینے والے۔ حاکم شرابی۔ امراء راشی۔ غنی عیاش۔ فقیر پست کردار، کیا ایسے ماحول (امیہ کا دور) میں کسی حدیث کا اپنی اصلی حالت میں رہنا ممکن تھا؟ بعض صحابہ سے بھی اخلاقی لغزشیں سرزد ہوتی رہتی تھیں۔ بخاری میں مذکور ہے کہ ایک صحابی روزے کی حالت میں جماع کر بیٹھے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ابنِ نعمان کو شراب نوشی پر سزا دی تھی۔ حضورؐ نے ایک صحابی پر زنا کی حد جاری کی تھی۔ رحلتِ رسولؐ کے بعد بعض مرتد ہو گئے تھے اور بعض نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ کی جنگ میں دونوں طرف صحابہ کی ایک بہت بڑی تعداد تھی اور ظاہر ہے کہ دونوں راستی پر نہیں ہو سکتے تھے۔ ان حالات میں بالکل ممکن ہے کہ کسی صحابی نے عمداً کسی حدیث کے الفاظ بدل دیئے ہوں اور سہو و نسیان کا خطرہ تو ہر وقت تعاقب میں رہتا تھا۔ دو سو پچاس برس تک یہ حدیثیں کروڑوں زبانوں پر جاری رہیں۔ ہر نیک و بد کے پاس پہنچیں۔ الفاظ بدلے مفہوم بدلا۔ اضافے ہوئے۔ لاکھوں نئی احادیث وضع کی گئیں، جن میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنایا گیا۔ جہاد پر ضرب کاری لگائی گئی، رہبانیت کو اچھالا گیا۔ اور ایک ایک وِرد پر ہزار ہزار جنتیں تقسیم کی گئیں۔ ان مشتبہ، گوش بریدہ اور خود تراشیدہ احادیث کا سیلاب عظیم جب حضرت امام بخاری کے دور میں داخل ہوا تو آپ نے چھ لاکھ احادیث میں سے جو آپ کو یاد تھیں، صرف ۲۷۰۵ انتخاب کیں اور باقی تمام کو ناقابلِ اعتماد قرار دیا۔

آپ نے انتخاب کا معیار راویوں کی صداقت کو قرار دیا۔ امام بخاری اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اڑھائی سو سال کا طویل زمانہ حائل تھا۔ چھ لاکھ احادیث، ہر حدیث کے کم از کم پانچ چھ راوی یعنی تیس پینتیس لاکھ راوی؛

جن میں سے بیس پچیس لاکھ لازماً مر چکے ہوں گے۔ نہ ان کے حالات محفوظ، نہ انہیں کوئی جاننے والا موجود۔ امام بخاریؒ کو کیسے پتہ چل گیا تھا کہ اس کے تمام راوی سچے تھے اور یہ کہ انہوں نے زندگی بھر میں نہ کوئی گناہ کیا تھا اور نہ کبھی جھوٹ بولا تھا۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ آپ کے معاصر یحییٰ بن معینؒ نے راویوں کے حالات قلمبند کئے تھے۔ لیکن ان کے متعلق بھی وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہیں یہ حالات کس نے بتائے تھے۔ اور دو سو سال پہلے کے راویوں کے متعلق انھوں نے معلومات کہاں سے حاصل کی تھیں؟ اگر آج ہمیں کہا جائے کہ محلے کے تمام ان لوگوں کے حالات قلمبند کرو، جو گذشتہ دو سو سال میں مر چکے ہیں، تو ہم کبھی نہیں کر سکیں گے۔ ممکن ہے مجملاً ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں صاحب پابندِ صوم و صلوٰۃ تھے لیکن اس کے کردار کی صحیح تصویر کھینچنا ہمارے لئے ناممکن ہوگا۔

علاوہ ازیں ہمارے سوانح نگاروں میں ایک خاص نقص بھی تھا، کہ وہ کسی کے کردار پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کے عادی نہیں تھے۔ ہمیشہ حسنِ ظن سے کام لیتے تھے اور مبالغہ آمیز مدح سرائی پر اتر آتے تھے۔ اس وقت ذہبی کا تذکرۃ الحفاظ میرے سامنے پڑا ہے جس میں ہزارہا بڑے بڑے راویان و حفاظِ حدیث کے حالات مرقوم ہیں۔ میں ایک ہی دَور کے چند راوی لے کر ذہبی کی زبانی ان کی کہانی سناتا ہوں جس سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ ہمارے بزرگوں کا اندازِ کردار نویسی ہی کیا تھا۔

مثلاً

1 علی ابن الحسین بن علی بن ابی طالب کے متعلق لکھتے ہیں،

كَانَ يُصَلِّيْ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ اَلْفَ رَكْعَةٍ

آپ رات دن میں ایک ہزار رکعت نماز پڑھا کرتے تھے۔ تذکرہ ص ۷۶

اگر سونے کھانے، ضروری حاجات اور وضو کے لیے کم از کم آٹھ گھنٹے الگ کر لئے جائیں تو باقی سولہ گھنٹے بچتے ہیں۔ اگر ہر رکعت پر اوسطاً دو منٹ صرف ہوں تو یہ تینتیس گھنٹے اور بیس منٹ بنتے ہیں اور ظاہر ہے کہ سولہ گھنٹوں کا کام سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔

۲۔ مطرف بن عبداللہ (وفات ۹۵ھ) کے متعلق لکھا ہے۔

کَانَ رَاساً فِی العِلْمِ وَالعَمَل

کہ آپ علم و عمل میں سردار تھے (تذکرہ صہ ۵۵)

۳۔ محمد بن سیرین (وفات ۱۱۰ھ) کے متعلق کہا:

عزیز العلم۔ ثقہ ..... کہ آپ علم میں بے مثل۔ قابلِ اعتماد.....

راس فی الورع اور تقویٰ میں سردار تھے۔ (تذکرہ صہ ۶۷)

۴۔ طاؤس بن کیسان (وفات ۱۰۶ھ) کے متعلق فرمایا:

کان راساً فی العلم والورع کہ علم و تقویٰ میں سردار تھا (تذکرہ صہ ۹۰)

۵۔ ابوصالح ذکوان (وفات ۱۰۱ھ کے متعلق ارشاد ہوا۔

مَن اجل الناس واوثقھم سب سے بڑا اور سب سے زیادہ قابلِ اعتماد

تذکرہ صہ ۸۹

۶۔ شعبی کے متعلق کہا

ما رائت اعلم وافقہ من شعبی — شعبی سے بڑا عالم اور عقلمند یا فقیہ میں نے نہیں دیکھا۔ تذکرہ صہ ۷۰

۷ عکرمہ (وفات ۱۰۵ھ کے متعلق لکھا:

مابقی احد اعلم بکتاب اللہ من عکرمہ — کہ عکرمہ سے بڑا کتاب اللہ کا کوئی عالم موجود نہیں تذکرہ صہ ۹۴

۸ القاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق (وفات ۱۰۶ھ) کے متعلق فرمایا:
ما رایت فقیہا اعلم من القاسم کہ مَیں نے قاسم سے بڑا فقیہہ نہیں دیکھا۔
تذکرہ ص ۸۴

۹ عطار بن ابی رباح (وفات ۱۱۴ھ) کے متعلق کہا:
ما رایت افضل من عطاء میں نے عطار سے بڑا عالم کوئی نہیں دیکھا
تذکرہ ص ۸۴

دیکھا آپ نے سوانح نویسی کا انداز۔ یہ سب محدثین ہم عصر تھے۔ ذہبی ہر ایک کو بے مثال، سب سے بڑا عالم، سردار" قرار دے گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ہی زمانے اور قریبًا ایک ہی ملک کے سب لوگ بے نظیر و بے مثال نہیں ہو سکتے۔ تو جن راویوں کے حالات ان مبالغہ پسند سوانح نگاروں نے اس فیاضی سے قلمبند کئے ہوں۔ ان پر اعتماد کر کے کسی قول کو بالکل صحیح سمجھ لینا درست نہیں۔

۱۰ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے موطا (امام مالک) کی ایک شرح لکھی تھی۔ جس کا نام "مصفّٰی" ہے۔ اس کے آخر میں کوئی اشفاق الرحمٰن صاحب حضرت مالک کے حالات یوں قلمبند کرتے ہیں:

" امام مالک نے اپنے ہاتھ سے ایک لاکھ حدیث لکھی۔ نو سو اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اور سترہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر درس دینا شروع کر دیا... جب موطا لکھ چکے تو اسے پانی میں پھینک کر کہنے لگے کہ اگر اس میں سچی احادیث ہیں تو یہ نہیں بھیگے گی۔ چنانچہ وہ نہ بھیگی۔ ایک دن حدیث پڑھا رہے تھے کہ بچھو کپڑوں میں گھس گیا۔ اس نے سولہ مرتبہ امام صاحب کو کاٹا۔ لیکن امام صاحب نے درس ختم کر کے ہی اس کی طرف توجہ دی.... "

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ اس سوانح نگار کو حقیقت نگاری سے کتنی چڑ ہے

ہر فقرہ اپنی تردید آپ کر رہا ہے۔ نو سو اساتذہ سے پڑھا بھی اور پھر سترہ برس میں فارغ التحصیل بھی ہو گئے۔ کوئی پوچھے کہ اس زمانے میں نو سو اساتذہ عرب میں جمع کہاں سے ہو گئے تھے؟ اگر بالفرض ہو ہی گئے تھے، تو یہ نہ بتایا کہ امام مالک ہر استاد کے پاس کتنا عرصہ رہے تھے۔ اگر ایک استاد کے پاس صرف ایک مہینہ بھی بسر کیا تھا تو بھی ان کا زمانۂ تعلیم پچھتر برس بنتا ہے۔ حالانکہ وہ سترہ برس کی عمر میں تعلیم ختم کر چکے تھے۔ اس گپ کے علاوہ وہ کتاب بھیگنے اور بچھو کاٹنے کا گپوڑ بھی قابلِ داد ہے۔

تو یہ ہیں وہ سوانح نگار، جن کی تحریرات کو ہم وحی سمجھ کر بعض راویوں کو سچا اور بعض کو جھوٹا قرار دیتے ہیں۔ اور پھر ان سچے راویوں کی احادیث ایک کتاب میں جمع کر کے ان کا نام رکھ دیتے ہیں "صحیح بخاری، صحیح مسلم" اور ساتھ ہی دنیا کو دھمکاتے ہیں کہ یہ وحی (خفی) ہے۔ اگر تم ان کتابوں پر ایمان نہ لائے تو تمہارا نام جنتیوں کی فہرست سے خارج کر دیا جائے گا۔

تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ حضرت صدیقؓ اور فاروقؓ حدیثوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر فنا کرتے رہے۔ ان کے بعد کیا ہوگا۔ اس سلسلے میں چند اور واقعات ملاحظہ فرمایئے۔

(۳) حضرت عبداللہ بن یسار فرماتے ہیں کہ ایک دن حضرت علیؓ نے تمام صحابہؓ کو جمع کر کے حکم دیا کہ یہاں سے واپس جانے کے بعد ہر شخص پہلا کام یہ کرے کہ جس کے پاس کوئی بھی تحریر ہو اسے مٹا ڈالے۔ کیونکہ پہلی قومیں اپنے علماء کی احادیث پر چلنے اور کتاب اللہ کو چھوڑنے کی وجہ سے ہلاک ہو چکی ہیں۔

(مختصر جامع بیان العلم ص ۳۳)

(۴) علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ ابی بن کعب جیسے جلیل القدر

صحابی کو روایت احادیث کی بنا پر پیٹنے پر تل گئے تھے اور اسی جرم میں حضرت عبد اللہ بن مسعود۔ حضرت ابوذر اور حضرت ابوالدرداء جیسے عظیم المرتبت اصحاب کو قید کر دیا تھا۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۷)

ان صحابہ کو یہ سزا اس لئے نہیں ملی ہوگی کہ لوگوں کو صحیح احادیث سنایا کرتے تھے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ صحیح و غلط میں امتیاز نہیں کر سکتے ہوں گے۔

(۵) آج حضرت عبد اللہ ابن مسعود کی طرف سینکڑوں احادیث منسوب ہیں۔ لیکن ابوعمرو الشیبانی بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ابن مسعود کی خدمت میں برسوں رہا اور ان کے منہ سے کوئی حدیث نہ سنی۔ ہاں جب کبھی مجبوراً کوئی حدیث بیان کرنی پڑتی تو خوف سے کانپنے لگتے اور فرماتے۔ رسول اللہؐ نے غالباً یوں فرمایا تھا یا یوں یا قریباً یوں۔

(تذکرۃ الحفاظ ج اول ص ۱۴)

یہ حال تھا اُن صحابہ کا، جن کے علم و فضل پر خود بارگاہِ رسالت کو ناز تھا۔ اور جن کے فضائل و فواضل ساری امت کے لیے سرمایۂ افتخار تھے۔ اندازہ لگا لیا آپ نے کہ یہ حضرات احادیث کے معاملے میں کس قدر محتاط واقع ہوئے تھے۔

۶۔ ابی اسحٰق مرۃ سے اور مرۃ عبد اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ کہا کرتے تھے۔

جب تمہیں حصولِ علم کی ضرورت پیش آئے تو قرآن پڑھو اس لئے کہ اس میں اولین و آخرین کا علم موجود ہے"

(تذکرہ ج ا ص ۱۲)

۷۔ ایک شخص نے ابی بن کعب سے کہا کہ مجھے کوئی نصیحت کیجیے فرمایا

اِتَّخِذ کِتَابَ اللہِ وَارْضَ بِہٖ حَکَمًا

کتاب اللہ کو ہاتھ میں لو اور صرف اسی کے فیصلوں پر عمل کرو۔

(تذکرہ ج ا ص ۱۵)

۸ حضرت عبداللہ بن عباس سینکڑوں احادیث کے راوی ہیں۔ لیکن علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ رحلتِ رسولؐ کے وقت آپ کی عمر صرف تیرہ برس کی تھی۔

(تذکرہ ج ۱۔ ص ۳۴)

تیرہ برس کا بچہ کسی حد تک غیر ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسے کیا خبر کہ نبی دنیا میں کیوں آتا ہے؟ اس کے اقوال کو کیا اہمیت حاصل ہوتی ہے؟ اور اگر ان اقوال میں ردّ و بدل ہو جائے تو کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں؟ اس طرح کے غیر ذمہ دار بچے اور آنحضرت صلعم میں اسناد کی کوئی اور کڑی قائم نہ کرنا اور خود انہیں عاقل، بالغ، ثقہ سمجھ کر رسول اکرم صلعم سے بلا واسطہ روایت کے قابل قرار دینا درست معلوم نہیں ہوتا۔

۹ ایک مرتبہ کاتب الوحی حضرت زید بن ثابت رضؓ معاویہ کے دربار میں گئے۔ امیر نے احادیث کی فرمائش کی۔ آپ نے چند احادیث سنائیں اور منشی دربار ساتھ ساتھ لکھتا گیا۔ آپ نے وہ کاغذ لے کر پھاڑ ڈالا اور فرمایا کہ رسول اللہؐ نے احادیث لکھنے سے منع فرمایا تھا۔ (بیان العلم صد ۳۲)

۱۰ علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت ابو موسیٰ رضؓ اشعری عمر فاروق رضؓ کے مکان پر گئے۔ تین آوازیں دیں اور واپس چل دیئے۔ حضرت فاروق رضؓ باہر نکلے۔ واپس جانے کا سبب پوچھا تو کہا:

"رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ ہر گھر پر تین آوازیں دو۔ اگر صاحب خانہ نہ بولے تو لوٹ جاؤ۔"

حضرت عمرؓ نے کہا اس حدیث پہ فوراً شہادت پیش کرو ورنہ میں تمہیں سزا دوں گا۔ وہ گھبرائے ہوئے مسجد نبوی میں پہنچے اور خوش قسمتی سے انہیں شہادت مل گئی ورنہ شاید پٹ جاتے۔ (تذکرہ ج ۱ ص ۶)

۱۱ اسود بن ہلال کوفی (وفات ۸۴ھ) کہتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس ایک بیاض یا کتاب لے کر گیا۔ جس میں کچھ احادیث درج تھیں۔ آپ نے پانی منگوا کر اس کتاب کو پہلے دھویا اور پھر جلا دیا۔ (جامع ص۳۳)

۱۲ ضحاک بن مزاحم (وفات ۱۰۵ھ) فرمایا کرتے تھے۔

"وہ زمانہ جلد آرہا ہے جب احادیث کی کثرت ہو جائے گی، لوگ کتابِ الٰہی کو ترک کر دیں گے۔ مکڑیاں اس پر جالے تنیں گی اور وہ گرد و غبار کے نیچے یوں دب جائے گی کہ نظر تک نہیں آئے گی۔" (جامع ص۳۳)

۱۳ عبدالرحمٰن بن الاسود بیان کرتے ہیں کہ میرے والد، علقمہ کے ہمراہ حضرت ابنِ مسعود کے ہاں گئے اور ان کی خدمت میں ایک مجموعۂ احادیث پیش کیا۔ آپ نے خادمہ کو آواز دی کہ ایک طشت میں پانی لاؤ۔ جب آگیا تو آپ نے اپنے ہاتھ سے اس مجموعے کو دھو ڈالا اور فرمایا:

اِنَّ ھٰذہٖ القلوب اوعیۃٌ فَاشْتَغلوھَا بالقرآن وَلَاتشتغلوھَابغیرہ

تمہارے دل برتنوں کی طرح ہیں۔ ان میں قرآن کے سوا کوئی اور چیز مت ڈالو (جامع ص۳۳)

کچھ عرصہ ہوئے آئرلینڈ کے شہرہ آفاق شاعر برنارڈ شاؔ نے اپنے یومِ ولادت پر اپنی دو تین تصانیف پر دستخط کر کے انہیں نیلام کیا اور آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ وہ دو تین چھوٹی چھوٹی کتابیں دو لاکھ چوبیس ہزار روپے میں فروخت ہوئیں برنارڈ شا کی تحریرات کی تو یہ قدر ہو اور رسول کے اقوال کو ان کے فدائی جہاں پائیں دھو ڈالیں اور یا مٹا دیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں؟ کیا ان لوگوں کو رسولؐ سے محبت نہیں تھی؟ اس کا جواب ایک ہی ہے کہ محبت تو تھی، لیکن وہ اقوال، اقوالِ رسولؐ نہیں تھے۔

۱۴ جریر بن عبدالحمید کہتے ہیں کہ منصور، مغیرہ اور الاعمش جیسے محدثین کتابت

احادیث کو گناہ سمجھتے تھے۔ (جامع صہ ۳۴)

قرضہ بن کعب کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم عراق کو روانہ ہوئے حضرت فاروقؓ مقام حرار تک ساتھ آئے۔ وہاں نماز ادا کی، اور پھر فرمایا کہ دیکھو میں ایک نہایت اہم بات کہنے کے لیے تمہارے ہمراہ یہاں تک آیا ہوں۔ اور وہ یہ کہ عراق کی سرزمین سے تلاوتِ قرآن کی سُریلی آواز یوں اٹھ رہی ہے۔ جس طرح چھتے کے اِرد گرد شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ خدا کے لئے انہیں احادیث میں پھنسا کر قرآن سے دُور نہ پھینکنا۔

(تذکرۃ الحفاظ ص ۶، وجامع بیان صہ ۱۷۴)

۱۶۔ رحلتِ حضورؐ سے صِرف تین برس پہلے حضرت ابوحریرہ رضؓ مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ لیکن روایتِ احادیث میں سب سے بازی لے گئے اور اسی سلسلے میں ایک مرتبہ پٹے بھی۔ واقعہ یوں ہے کہ آپ رسولِ اکرم صلعم کے ہاں تشریف لے گئے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اے ابوحریرہ جا اور ہر اس شخص کو جنت کی بشارت دے دے، جس نے زبان سے لاَ اِلٰہَ کہہ دیا ہو۔ ابوہریرہ باہر نکلے تو سب سے پہلے حضرت عمرؓ بن خطاب سے ملاقات ہوئی اور یہ بشارت سنائی۔ حضرت عمرؓ نے ابوہریرہ کی چھاتی پر ایک گھونسہ کھینچ مارا جس سے وہ زمین پر گِر گئے اور رونی صُورت بنائے واپس دربارِ رسالت میں پہنچے۔ پیچھے پیچھے عمرؓ بھی پہنچ گئے۔ حضورؐ نے پوچھا کہ اسے کیوں پیٹا ہے؟ کہا کیا آپ نے صرف لاَ اِلٰہ کہنے پہ جنت کی بشارت دی ہے۔ فرمایا، ہاں۔ عمرؓ نے کہا: ازراہِ نوازش ایسا نہ کیجئے۔ ورنہ لوگ اعمال کو ترک کردیں گے۔ فخلھم یعملون (آپ لوگوں کو کام کرنے دیں) حضورؐ نے فرمایا، بہت اچھا لوگوں کو کہہ دو کہ کام کریں۔ (ملخص)

(صحیح مسلم کتاب الایمان طبع مجتبائی صہ ۴۵ مع فتح الملہم)

ملاحظہ کیا آپ نے کتنی دلچسپ حدیث ہے۔ صرف دو لفظ (لا الٰہ) منہ سے نکالو اور جنت لے لو۔ نہ صوم و صلوٰۃ کی ضرورت، نہ میدانِ جہاد میں لہو بہانے کی حاجت، نہ صدقہ و زکوٰۃ کے جھمیلے اور نہ جہادِ اکبر و اصغر کے جھگڑے دوسری دلچسپی یہ کہ حضرت فاروق بارگاہِ رسالت کو حکم دیتے ہیں ولا تفعل فخلہم یعملون۔ آپ لوگوں کو ایسی احادیث نہ سنایا کیجیے۔ مطلب یہ کہ ایسی احادیث سنا کر انہیں خراب نہ کیجیے، اور لوگوں کو کام کرنے دیجیے۔ یعنی مذہب کے معاملے میں حضرت فاروقؓ سرورِ کائنات کی راہنمائی فرماتے ہیں اور لطف یہ کہ حضورؐ اس حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اور فرماتے ہیں فخلہم (بہت اچھا لوگوں کو کام کرنے دو) بدیگر الفاظ رسولِ اکرم صلعم نے اعتراف فرمایا کہ ان کی حدیث (مَن قالَ لَا اِلٰہ) سے لوگ بے عمل ہو سکتے ہیں۔

غور فرمائیے کہ اس حدیث نے حضور پُر نور کی منزلت کو کتنا کم کر دیا کہ ان کا ایک طفلِ مکتب انہیں سیدھا رستہ دکھا رہا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ اس قسم کی احادیث تراشا کرتے تھے بلکہ یہ ہے کہ یار لوگ گھڑ کر ان کا نام جڑ دیتے تھے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ خود ابوہریرہؓ بھی روایت میں قدرے غیر محتاط ہوں۔ علامہ ذہبی نے ان کا یہ فقرہ نقل کیا ہے۔

قال ابوهريرة لقد حدثتكم باحاديث لو حدثت بها فى زمن عمر بن الخطاب لضربنى بالدرة	حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایسی ایسی احادیث بیان کی ہیں کہ اگر عمر بن الخطاب کے زمانہ میں روایت کرتا تو وہ مجھے دُرّے سے پیٹ ڈالتے۔

(تذکرۃ الحفاظ ص۸)

کیوں پیٹ ڈالتے ؟ سرورِ کائنات کا اسوہ بیان کرنے پر ؟ کیا کوئی مسلمان ایسا کر سکتا ہے ؟ نہیں ، بلکہ مشتبہ احادیث کی روایت پر ۔ حضرت عمرؓ اسی لئے تو احادیث جلا دیا کرتے تھے اور بڑے بڑے صحابہ کو اس جرم میں قید و بند کی سزا دیتے تھے ۔ جس عمرؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کو حضورِ پُرنور کی زندگی میں پیٹ ڈالا تھا اور جس نے رسولِ اکرم صلعم کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کہہ دیا تھا حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہ وہ اپنے عہدِ خلافت میں ابوہریرہ یا کسی اور بزرگ کو روایتِ احادیث کی اجازت کیسے دے سکتا تھا ؟ ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ حدیث وحیٔ غیر متلو ہے ۔ اس پر ایمان لائیے ۔ میں اس قسم کے علماء سے صرف ایک سوال پوچھتا ہوں کہ آپ بڑے مسلمان ہیں یا حضرت عمرؓ ؟ اللہ اور رسولؐ کی منشا سے وہ زیادہ باخبر تھے ، یا آپ ؟

حاشا و کلا کہ مجھے حدیث سے بغض نہیں بلکہ ان انسانی اقوال سے ضد ہے ۔ جنھیں یہودیوں زندیقوں اور ہمارے فرقہ باز راہنماؤں نے تراش کر مہبط الوحی صلعم کی طرف اس لئے منسوب کر دیا تھا کہ خدا رسول اور قرآن کا کوئی وقار دنیا میں باقی نہ رہے ۔

ہمارے موجودہ علماء میں ایک دو بڑی بڑی خوبیاں موجود ہیں ۔

اوّل یہ کہ ان کا دامن وضعِ احادیث کے داغ سے ملوث نہیں ۔

دوم ۔ انہیں سرورِ کائنات سے گہری محبت ہے اور ایک دو خرابیاں بھی ہیں

اوّل ۔ کہ ملکۂ تنقید سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے وہ صحیح و غلط میں تمیز نہیں کر سکتے ۔ دوم وہ اسلاف پرستی اور اندھی تقلید کے امراض میں مبتلا ہیں ۔ چونکہ ہمارے بعض اسلاف کہہ بیٹھے ہیں کہ صحیح بخاری کی ہر حدیث صحیح ہے ۔ اس لئے ہمارے علماء بخاری کی کسی حدیث کو ناقدانہ نظر سے دیکھنا یا معیارِ درآیت پر پرکھنا

کفر سے کم نہیں سمجھتے۔ شیخ عبدالحق دہلوی کی رائے تھی کہ صحاح میں انسانی اقوال کی آمیزش ہے۔ علامہ ابن حجر کا خیال تھا کہ صحیح بخاری کی چالیس احادیث مشتبہ ہیں۔ ملاحظہ ہو حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا رسالہ الفرقان شاہ ولی اللہ ص ۲۶۹، ۲۷۶)

اور شیخ حمید الدین فراہی فرماتے ہیں:

"میں نے صحاح میں بعض ایسی احادیث دیکھیں جو قرآن کا صفایا کر دیتی ہیں۔ ہم اس عقیدے سے پناہ مانگتے ہیں کہ کلام رسول، کلام خدا کو منسوخ کر سکتا ہے۔ (نظام القرآن)

(۱۵) شعیب بن حرب (وفات ۱۹۷ھ) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن سفیان ثوریؒ کے ہاں حدیث کا ذکر چل پڑا تو آپ نے کہا:

لَوْکَانَ فِیْ ھٰذَا الْحَدِیْثِ خَیْرٌ لَنَقَصَ	اگر حدیث کوئی اچھی چیز ہوتی تو
کَمَا یَنْقُصُ الْخَیْرُ وَلٰکِنَّہٗ شَرٌّ فَارَاہُ	باقی نیکیوں کی طرح یہ بھی گھٹتی جاتی
یزید کما یزید الشر	لیکن یہ بڑھ رہی ہے اس لیے یہ
(جامع ص ۱۷۸)	ایک بدی ہے۔

(۱۸) جب سفیان بن عیینہ سے حدیث کی فرمائش کی گئی تو آپ نے فرمایا:

ما ادری الذی تطلبونہ من الخیر،	تم جس چیز کی تلاش میں ہو وہ کوئی نیکی نہیں
ولو کان خیرا لنقص کما ینقص الخیر	ہے۔ اگر نیکی ہوتی تو باقی نیکیوں کی طرح کم
(جامع ص ۱۷۸)	ہوتی جاتی۔

(۱۹) بکر بن حماد (دوسری صدی کا ایک شاعر) مضمون بالا کو یوں ادا کرتے ہیں:

اری الخیر فی الدنیا یقل کثیرہ	وینقص نقصا والحدیث یزید
ولو کان خیرا قل کالخیر کلہ	فاحسب ان الخیر منہ بعید

میں دیکھ رہا ہوں کہ دنیا میں نیکی کم ہو رہی ہے۔ لیکن حدیث بڑھ رہی ہیں۔ اگر

حدیث ایسی چیز ہوتی تو باقی نیکیوں کی طرح یہ بھی گھٹتی جاتی۔ پس میں یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوں کہ حدیث کا نیکی سے کوئی تعلق نہیں۔

(توجیہ النظر شیخ طاہر بن صالح ص ۹-۱۸۰)

(۲۰) بشران حارث کہتے ہیں کہ میں نے ابو خالد الاحمر الکوفی (وفات ۱۹۶ھ) کو یہ فرماتے ہوئے سُنا:

یاتی علی الناس زمان تعطل فیھا	ایک ایسا زمانہ بھی آرہا ہے کہ لوگ
المصاحف لا یقرء فیھا و یطلبون	قرآن شریف کو ایک طرف رکھ دیں گے
الحدیث	اور احادیث کی تلاش میں نکل پڑیں گے۔

جامع صفحہ ۱۸۰

اور وہ زمانہ دوسری صدی سے شروع ہوتا ہے اور اب یہ عالم ہے کہ ساری امت قرآن سے بیگانہ ہو چکی ہے۔ قوائے عمل پہ اوس پڑ چکی ہے۔ ہر فرد حدیث کی ارزاں جنت کی تلاش میں ہے۔ سارا زور اوراد و وظائف پہ صَرف ہو رہا ہے۔ صِرف وضو کرنے پر گناہوں کی مغفرت ہو رہی ہے۔ چند الفاظ کے ورد پر زمرد اور موتیوں کے محل تیار ہو رہے ہیں۔ نماز میں رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ کہنے پر زندگی کی تمام سیاہ کاریاں دھوئی جا رہی ہیں اور حلوے کا ایک لقمہ کھلانے سے عذابِ قبر ٹل رہا ہے۔ کہیئے کہ اس قدر سستی جنت کو چھوڑ کر قرآن کے شمشیر و سناں، صبر و ابتلا، خوف و جُوع اور ایثار و شہادت والے اسلام کے قریب کون جائے؟ کون عمر بھر کی کمائی قوم کے حوالے کر دے۔ دسمبر کی ٹھنڈی راتوں میں برفانی پہاڑوں پہ کون پہرہ دے۔ طیاروں کی بمباری کون سہے ٹینکوں کے آگے میلوں کون بھاگے اور گولیوں سے سینہ چھلنی کرا کے بہشت کون لے؟ کیوں نہ مسجد میں گھس کر کچھ وقت کے لئے اللہ اللہ کرے اور مرنے کے

بعد سیدھا جنت میں چلا جائے۔

من کان سبحان الله وبحمده	جو شخص دن میں سو مرتبہ سبحان اللہ وبحمدہ
فی یوم مائة مرة حطت منه	کا ورد کرے گا اس کی تمام سیاہ کاریاں مٹا
خطایاه وان کانت مثل زبدة	ہو جائیں گی خواہ وہ سمندر کی جھاگ سے بھی زیادہ
البحر	ہوں۔

(موطا امام مالک مطبع مجتبائی طبع ۱۳۴۵ھ صہ ۷۳)

موطا کے اسی صفحے پر ایک اور حدیث دی ہوئی ہے جو موطا میں موقوف (حضورؐ تک نہیں پہنچی بلکہ کسی صحابی کی رائے ہے) اور ترمذی و ابنِ ماجہ میں باقاعدہ حضورؐ سے مروی ہے :۔

من ابی الدردا قال الا اخبرکم بخیر	ابی الدردا (صحابی) کہتے ہیں آؤ میں تمہیں
اعمالکم وارفعها فی درجاتکم و	بتاؤں کہ سب سے بہتر عمل جس سے تمہارے
خیر لکم من ان تلقوا عدوکم	مدارج بہت بلند ہو جائیں۔ کون سا ہے ایسا
فتضربوا اعناقکم و یضربوا اعناقهم	عمل جو سونے اور چاندی کی قربانی اور جہاد سے
قالوا بلیٰ ۔ قال ذکر الله تعالیٰ	بھی بہتر ہو۔ وہ جہاد جس سے تم دشمن کا سر

کاٹتے ہو اور وہ تمہارا۔ لوگوں نے کہا فرمایئے! کہا اللہ کا ذکر۔

(موطا صفحہ ۷۳)

ہر صاحب علم جانتا ہے کہ حدیث کی دنیا میں موطا کا درجہ کتنا بلند ہے۔ اس بلند کتاب میں اس حدیث کو پڑھنے کے بعد کسی کو کیا پڑی ہے کہ وہ ملک وملت کی حفاظت یا اپنی مستورات کی عزت وعصمت بچانے کے لئے سر دیتا پھرے وہ غلام رہے یا آزاد اس کی بلا سے۔ ساری دنیا جنت کے لیے مرتی ہے اور یہ نعمت اس کو زبانی یادِ خدا سے مل سکتی ہے۔ پھر وہ خواہ مخواہ دکھ کیوں اٹھائے۔

اور اپنی لاش کو خاک و خون میں کیوں تڑپائے :۔

(۲۰) وقیع فرماتے ہیں کہ امام داؤد طائیؒ سے کسی نے پوچھا کہ آپ احادیث کی روایت کیوں نہیں کرتے، فرمایا:۔

" میں بچوں کا کھلونا نہیں بننا چاہتا۔"

(جامع صہ ۱۸۰)

(۲۱) ایک مرتبہ چند طلبا ئے حدیث حضرت فضیل بن عیاض کے ہاں درسِ حدیث لینے کے لیئے آئے۔ آپ نے انہیں ان الفاظ میں ڈانٹ پلائی :۔

انکم قد ضیعتم کتاب اللہ ولو طلبتم کتاب اللہ لوجدتم فیہ شفاء ثم قر یاایھا الناس قد جاءتکم موعظة من ربکم و شفاء لما فی الصدور و ھدی و رحمة للمومنین۔ قل بفضل اللہ وبرحمتہ فبذلک فلیفرحوا خیر مما یجمعون

تم لوگوں نے اللہ کی کتاب کو ضائع کر دیا ہے۔ اگر تم کتابِ الٰہی کی تلاش کرتے تو اس میں تمہیں شفا مل جاتی اور اس کے بعد یہ آیت پڑھی اے لوگو! تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ضابطۂ حیات آچکا ہے جس میں دل و دماغ کی تمام بیماریوں کا علاج درج ہے اور اہلِ ایمان کے لیئے ہدایت بھی ہے اور رحمت بھی۔ اے رسول ان مسلمانوں کو کہہ دو کہ وہ اللہ کی اس رحمت اور اس نعمت (قرآن) پر خوش ہوں۔ اور یہ قرآن اس چیز (اس سے مراد حدیث بھی ہو سکتی ہے) اس سے اچھا ہے جسے وہ جمع کر رہے ہیں۔

(از جامع صہ ۱۴۱)

تو جو کتاب شفا بھی ہے، موعظت و رحمت بھی، اللہ کا فضل بھی ہے اور نعمت بھی۔ کیا وہ ہدایت کے لئے کافی نہیں ؟

○

تدوینِ حدیث

جیساکہ ہم عرض کر چکے ہیں. صحابہ کبار جمع احادیث کے خلاف تھے۔ صحابہ کرام میں سے چند بزرگ یعنی انس بن مالکؓ . ابوہریرہؓ اور عبداللہ بن عمرؓ ایسے نظر آتے ہیں: جن کے پاس کچھ احادیث محفوظ تھیں. سُنن ابی داؤد میں یہ حدیث ملتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے رسولِ اکرم صلعم سے دریافت کیا کہ کیا میں آپ کے اقوال لکھ سکتا ہوں تو حضورؐ نے فرمایا: اِنّی لَا اقول اِلَّا حقًا بے شک لکھ لیا کرو۔ اس لئے کہ میں ہمیشہ سچ بولتا ہوں۔

حیرت ہے کہ جس ہستی نے کتابت حدیث سے منع فرمایا تھا (مسلم) اور جس کے جلیل القدر جانشین آپ کے ارشاد کی تعمیل میں نہ صرف اپنے مجموعے بلکہ ہر صحابی کے مجموعے ڈھونڈ ڈھونڈ کر فنا کرتے رہے، اسی ہستی نے عبداللہ بن عمرؓ کو کتابت کی اجازت کیسے دے دی تھی؟ مزید حیرت اس امر پر کہ جب حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے احادیث جلانے یا مٹانے کا حکم دیا تھا تو حضرت ابنِ عمرو نے کیوں تعمیل نہ کی۔ کیا قرآن کی رُو سے اولی الامر کی تعمیل فرض نہیں؟ یا تو ہم یہ تسلیم کریں کہ صحیح مسلم کی حدیث غلط ہے اور یا ابن عمروؓ کو رسولِ خدا اور خلفائے کرام کی حکم عدولی کا ملزم ٹھہرائیں۔ حضورؐ کے خلفا کے عمل سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ صحیح مسلم کی حدیث صحیح ہے۔ اور اگر مسلم کی حدیث کو صحیح قرار دیں، تو ابو داؤد والی حدیث وضعی ثابت ہوتی ہے۔

مسند ابن وہب میں حضرت ابوہریرہ رضؓ کے متعلق لکھا ہے کہ آپ احادیث لکھ لیا کرتے تھے۔ لیکن صحیح بخاری میں خود ابوہریرہ رضؓ کی یہ روایت موجود ہے:

ما من اصحاب النبی اکثر حدیثا منی الا عبداللہ بن عمر وفانہ کان یکتب وکنت لا اکتب

تمام صحابہ میں صرف عبداللہ بن عمروؓ کی روایات مجھ سے زیادہ تھیں۔ اس لئے کہ وہ احادیث لکھ لیا کرتے تھے اور میں نہیں لکھا کرتا تھا۔

چونکہ امام بخاری کی صحیح مسند مذکور سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔ اس لئے مسند کے بیان کو ہم صحیح قرار نہیں دے سکتے۔

حضرت انسؓ کے متعلق روایت ترمذی میں ملتی ہے آپ سرورِ کائناتؐ کے خادمِ خاص تھے اور عمر میں بہت چھوٹے۔ یعنی جب حضور مدینہ میں تشریف لائے تھے تو حضرت انسؓ کی عمر صرف ساڑھے نو برس تھی اور رحلتِ حضورؐ کے وقت قریباً بیس برس اپنے اردگرد نظر ڈال کر دیکھئے اور اندازہ لگایئے کہ کیا کوئی لڑکا اٹھارہ انیس برس کی عمر تک کسی قسم کی کوئی ذمہ داری محسوس کر سکتا ہے؟ حضرت انسؓ کا کام تھا حرمِ نبوی اور فاتِ نبوی کی خدمت دن کا بیشتر حصہ خرید و فروخت، لین دین، جھاڑ پھونک میں گذر جاتا تھا۔ کچھ فرصت ملتی تو قرآن شریف یاد کیا کرتے تھے۔ وہ ارشاداتِ نبوی ضرور سنتے ہوں گے۔ لیکن لڑکپن کا زمانہ تھا، انہیں کیا پڑی تھی کہ ہر ارشاد اور ہر واقعہ تمام جزئیات کے ساتھ یاد کرتے پھرتے۔ واقعہ سامنے آیا اور گذر گیا۔ کچھ یاد رہا اور کچھ بھول گیا۔ کوئی بات کان سے ٹکرائی سن لی اور پھر کام میں لگ گئے۔ لیکن جب حضور کی رحلت کے بعد لوگ قرآن کو چھوڑ کر حدیث کے پیچھے

پڑ گئے اور راویانِ حدیث کی منزلت بڑھ گئی تو آپ نے بھی بھولے بسرے واقعات اور گوشِ گذشتہ ارشادات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ممکن ہے کوئی ارشاد بالفاظہٖ یاد رہا ہو اور بعض دیگر کا خاکہ خود مکمل کر لیا ہو۔ بہرحال جو احادیث آپ سے مروی ہیں۔ ان کی تعداد ۱۲۸۶ ہے۔ جن میں سے ۱۶۸ کی صحت پر ائمۂ حدیث کا اتفاق ہے اور باقی ۱۱۱۸ کو ناقابلِ توجہ سمجھا جاتا ہے۔ امام بخاری نے ان منفقہ احادیث میں سے صرف ۸۳ نقل کی ہیں۔ مسلم نے ۷۱ اور باقی کو مشکوک سمجھ کر نظرانداز کر دیا ہے۔ اتنی کانٹ چھانٹ کے بعد بھی آپ کی بعض احادیث بدستور محلِ نظر ہیں۔ مثلاً

انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسولِ کریم صلعم بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ آپ کے پاس جبریل آیا۔ آپ کو پکڑا۔ زمین پر گرایا۔ سینہ چیر کر دل نکالا، پھر دل کو چیرا اور ایک ٹکڑے کے متعلق کہا کہ یہ شیطان والا حصہ ہے اس حصے کو سونے کے طشت میں آبِ زمزم سے دھویا۔ پھر دوسرے ٹکڑے کے ساتھ جوڑ کر دوبارہ سینہ میں رکھ دیا اور اس زخم کا نشان تادمِ آخریں باقی رہا"

صحیح مسلم مع فتح الملہم ص۳۲۳

یہ حدیث کئی طرح سے مشکوک ہے۔

اول: جب حضور بچپن میں بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ تو حضرت انسؓ کہاں تھے۔ آپ ایک ایسے واقعے کو بیان کر رہے ہیں۔ جو آپ کی پیدائش سے قریباً چھتیس برس پہلے ہوا تھا۔ اگر آپ نے یہ واقعہ کسی سے سنا تھا تو اس کا نام بتانا ضروری تھا۔

دوم: دل کے دو حصے ہیں۔ دایاں حصہ خون کو پھیپھڑوں میں بھیجتا ہے، جو وہاں سے صاف ہو کر دل کے بائیں حصے میں داخل ہوتا ہے اور پھر جسم میں

چلا جاتا ہے۔ دِل ایک پمپ ہے جس کا کام لہو کو پہلے پھیپھڑوں میں بھیجنا اور پھر جسم میں دھکیلنا ہے۔ یہ صرف گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ جو ہاتھ اور پاؤں کی طرح لذت والم کا احساس نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی خیر و شر کا محرک ہے۔ تمام افکار، جذبات، خیالات اور تصورات کا مرکز دماغ ہے۔ خیر و شر کی تحریک یہیں پیدا ہوتی ہے اور ارادے یہیں بندھتے ہیں۔ اگر جبرئیل کا مقصد منبع شر کو مٹانا تھا تو دماغ کو چیرتا نہ کہ دِل کو۔ اس میں کلام نہیں کہ ہمارے صوفیاء اور شعراء دِل ہی کو سبھی کچھ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جذبات کا مرکز دِل ہے۔ لیکن غلط فہمی سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ دماغ کو مجازاً دِل کہہ دیں۔ بہر حال آپ دماغ کو دماغ کہیں یا دِل۔ حقیقت یہی ہے کہ خیر و شر کی تمام تحریکات دماغ سے ابھرتی ہیں اور دماغ کا مسکن کھوپڑی ہے۔ نہ کہ سینہ۔ چونکہ اس حدیث کا واضع دل ہی کو سب کچھ سمجھتا تھا۔ اس لئے اس نے یہ حدیث گھڑتے وقت قطعاً نہ سوچا کہ جب علم ترقی کر جائے گا تو اس وقت کے لوگ اس حدیث کو پڑھ کر خدا، رسولؐ اور جبرائیلؑ کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے یہی کہ خاکم بدہن ہر سہ دِل و دماغ کی ساخت اور ان کے اعمال سے ناآشنا تھے۔

سوم گناہ کی دنیا حسین بھی ہے اور لذیذ بھی۔ انسان اسی صورت میں کامل بن سکتا ہے کہ وہ گناہ کی ترغیبات کو جھٹک کر نیکی کی اجاڑ راہوں پر بڑھتا چلے۔ ایک حسین جوان کا تیرِ نگاہ سے بچ جانا اس کا کمال ہے۔ لیکن اگر کوئی پیرِ صد سالہ یہ کہے کہ میں عورتوں کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا نگاہ کی توہین سمجھتا ہوں تو لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے۔ اس لئے ہمیں اس رسولؐ پر ناز ہے جو بشر ہوتے ہوئے بھی ہر ترغیب، ہر کشش اور ہر گناہ سے دامن بچا کر نکل گیا تھا۔ نہ اس رسول پر کہ جس کا اپریشن کر کے خطا کاری کی استعداد ہی سے محروم کر دیا گیا تھا۔

چہارم اگر اللہ کی منشا یہی تھی کہ ہر نبی معصوم ہو تو وہ ماں کے پیٹ میں ان کے دماغ کی ساخت ویسی بنا سکتا تھا کہ گناہ کا ارادہ ہی پیدا نہ ہو سکتا اور بعد میں جبرئیل سے اپریشن (اور وہ بھی غلط مقام پر) کرانے کی ضرورت باقی نہ رہتی۔

پنجم: یہ زمزمہ کے پانی سے مرکزِ گناہ کو دھونے کی بھی خوب کہی۔ اگر کوئی شخص بجلی کے تاروں کو پانی سے دھونا شروع کر دے اور کہے کہ میں ان تاروں سے بجلی ختم کر کے رہوں گا تو آپ اس کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔ دل یا دماغ میں نیکی یا گناہ کا صرف ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہم دماغ سے بھیجا نکال کر اسے پانی سے دھونا شروع کر دیں اور کہیں کہ آج ارادوں کا تمام مواد ختم کر کے ہی دم لیں گے تو لوگ کیا کہیں گے؟

تو یہ ہے حقیقت حضرت ابوہریرہؓ، عبداللہ بن عمروؓ اور انس بن مالکؓ کے مجموعہ ہائے حدیث کی۔ صحابہ کے بعد تابعین کا زمانہ آیا۔ تذکروں میں مذکور ہے کہ مغیرہ، شعبی، اعمش اور قاسم جیسے علمائے تابعین جمع احادیث کو ناجائز سمجھتے رہے۔ امام بن شہاب الزہری المدنی (وفات ۱۲۴ھ) پہلا محدث ہے جس نے عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے کچھ احادیث جمع کیں۔ آپ کے بعد ابنِ جریح نے مکہ میں۔ ابنِ اسحاق اور مالک نے مدینہ میں۔ ربیع بن صبیح۔ سعد بن عروبہ اور حماد بن سلمہ نے بصرہ میں۔ سفیان ثوری نے کوفہ میں۔ اوزاعی نے شام میں، ہشیم نے واسط میں۔ معمر نے یمن میں، جریر نے رے میں اور ابنِ مبارک نے خراسان میں یہی کام شروع کیا۔ لیکن امام مالک کے بغیر باقی سب کے مجموعے ضائع ہو گئے۔ دوسری صدی کے آخر میں چند اور مجموعے مرتب ہوئے مثلاً مسند اسد ابنِ موسیٰ، مسند عبیداللہ بن موسیٰ العبسی، مسند

بصری اور مسند نعیم ابن المحاد الخزاعی۔ تیسری صدی کے آغاز میں امام احمد بن حنبل امام بخاری، مسلم اور ابو داؤد وغیرہ تدوینِ احادیث کی طرف متوجہ ہوئے ابن حنبل نے چالیس ہزار احادیث جمع کیں۔ ان کے راویوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ ان احادیث کو روایت و درایت کے معیار پر پرکھنے کے لیئے وقت نہ نکال سکے امام بخاری پہلے محقق ہیں جنہوں نے چھ لاکھ احادیث (امام بخاری تک صرف چھ لاکھ پہنچی تھیں۔ ورنہ یحییٰ بن معین کو ۱۲ لاکھ احادیث کا علم تھا) میں سے صحیح احادیث انتخاب کرنے کے لیئے انتہائی کوشش کی۔ بعض اوقات ایک ایک حدیث کے لیئے کئی کئی استخارے کیئے۔ یعنی جو کچھ انسانی طاقت میں تھا، انہوں نے کیا۔ لیکن جن احادیث کو مشتبہ سمجھ کر فاروق رضؓ و صدیق جلا رہے تھے وہ اڑھائی سو برس بعد کیسے صحیح بن سکتی تھیں۔ پھر اس عرصے میں ہزاروں جعلساز پیدا ہو چکے تھے جن کا پیشہ ہی حدیث تراشی تھا۔ علامہ محمد طاہر گجراتی نے اپنی مشہور تصنیف "قانون الاخبار الموضوعة والرجال الضعفاء" میں قریباً دو ہزار ایسے اشخاص کے نام دیئے ہیں جو زندگی بھر احادیث گھڑتے رہے۔ کسی نے ہزار تراشیں اور کسی نے دس ہزار۔ موضوعاتِ کبیر میں ملا علی قاری لکھتے ہیں کہ ابنِ عکاشہ اور محمد بن تمیم نے دس ہزار احادیث وضع کی تھیں جب ابنِ ابی العوجا زندیق گرفتار ہوا تو اس نے اقرار کیا کہ میں چار ہزار احادیث گھڑ چکا ہوں۔ جب خلیفۂ وقت نے دریافت کیا کہ وضعِ حدیث سے تمہارا مقصد کیا تھا تو کہا کچھ نہیں، صرف قرآن کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال بناتا رہا۔

بالکل درست کہا تھا ابن ابی العوجا نے۔ عام احادیث کو تو جانے دیجیئے صحاحِ ستہ میں بعض ایسی احادیث راہ پا چکی ہیں جو نہ صرف قرآن سے متصادم ہوتی ہیں بلکہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند علم، عظیم المرتبت شخصیت اور بے مثال کردار

کے سنت منافی ہیں۔ تفصیل آگے آئے گی۔ اسی بنا پر مولانا عبید اللہ سندھی رحؒ نے فرمایا تھا:

"میں ایک یورپین نومسلم کو کتاب بخاری کیوں نہیں پڑھا سکتا؟ اس کی وجہ میں مجلس عام میں نہیں بتا سکتا۔

(الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر صہ ۲۸۵)

یہ نہ سمجھئے کہ احادیث تراشی کا کام صرف یہود، منافق اور زنادقہ ہی کیا کرتے تھے۔ بلکہ بڑے بڑے قضاۃ بھی اس "کارِ خیر" میں شامل تھے۔ مثلاً ابن ابی یحییٰ مدینہ میں۔ الواقدی بغداد میں اور مقاتل بن سلیمان خراسان میں بیٹھ کر احادیث گھڑا کرتے تھے۔ علامہ ابن جوزی نے وضاعین کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ جس میں قاضی وہب بن وہب، محمد بن سعید الشامیؒ الوداود النخعی غیاث بن ابراہیم النخعی، مغیرہ بن سعد کوفی۔ احمد بن عبداللہ جوبیاری۔ ماعون بن احمد الہروی، محمد بن قاسم طالقانی اور محمد بن زیاد الیشکری جیسے "بزرگانِ قوم" شامل ہیں۔ (تذکرۃ الموضوعات۔ علامہ محمد طاہر صہ ۹)

معرفۃ علوم الحدیث (صہ ۶۰) میں مذکور ہے۔ ابان نے جعلی احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا اور ہر روایت میں حضرت انس بن مالک کا نام جڑ دیا تھا۔ مقامِ تعجب نہیں۔ اگر حضرت انس کی وہ سینہ چیرنے والی حدیث بھی اسی قسم کے مجموعے سے نقل کر صحیح مسلم میں جا پہنچی ہو۔ علامہ الوالخیر شمس الدین السخاوی مقاصد میں لکھتے ہیں۔ تفسیری احادیث کے دو مجموعے تیار ہو چکے ہیں ایک کلبی کا اور دوسرا مقاتل بن سلیمان کا۔ کلبی کے متعلق احمد بن حنبل نے لکھا ہے کہ اس کی ایک بھی حدیث صحیح نہیں"۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض مفسرین اپنے عقائد کے مطابق احادیث گھڑتے رہے۔ جن میں عبدالرحمٰن بن کیسان الاصم۔ الجبائی الرمانی

زمخشری (صاحب کشاف) ابی عبدالرحمٰن السلمی، الثعلبی اور الواحدی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے نہایت دور از کار مطالب بیان کئے اور ایسی احادیث وضع کیں کہ عقل سر پیٹ کے رہ جائے۔ مثلاً ایک مفسر مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ (دنیا کے دو سمندر آپس میں مل رہے ہیں) کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بحرین (دو سمندر) سے مراد حضرت علیؓ اور فاطمہؓ ہیں اور یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ (ان سمندروں سے موتی اور مرجان نکلتے ہیں) لولو و مرجان سے مراد حسینؓ و حسنؓ ہیں"

(مقاصد و تذکرۃ الموضوعات ص۸۲)

ملاحظہ کیا آپ نے کہ وضعِ احادیث میں کیسے کیسے بزرگوں کی "دعا و ہمت" شامل تھی۔ منافقوں، یہودیوں اور دشمنانِ اسلام کا تو ذکر ہی نہ کیجئے کہ ان کا تو مقصد ہی اسلام کے چشمۂ مصفا کو مکدر کرنا تھا۔ بات کیجئے اپنے بڑے بڑے جبہ پوش قاضیوں کی اور خضر صورت واعظوں کی کہ نہ اللہ سے ڈرے نہ رسولؐ سے شرمائے۔ نہ نقصانِ مایہ کی فکر کی نہ شماتتِ ہمسایہ کا خیال آیا۔ اور چودہ لاکھ احادیث کا طومارِ عظیم تراش کر ملت کے سر پر دے مارا اور کہا کہ یہ ہے تمہارا لائحہ عمل۔ قرآن وحی جلی تھا اور یہ وحی خفی۔ قرآن مجمل تھا اور یہ مفصل، فالہم ہذا۔ قرآن ناقص تھا (کہ اس میں ادائے صلوٰۃ کا طریقہ درج نہیں) اور یہ مکمل اس لیئے اسے اپنانا ہی پڑے گا۔

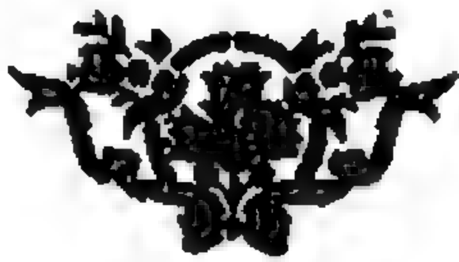
زندگی کی چند روزہ وجاہت اور چند ٹکوں کی خاطر ان لوگوں نے تعلیم اسلام کا ستیاناس کر ڈالا اور اللہ کے انقلاب انگیز، حیات آفرین اور سکون بخش پیغام میں وہ وہ اباطیل و خرافات داخل کر دیئے گئے کہ الامان والحفیظ ملت کی ذہنیت مسخ ہو گئی۔ تصوراتِ حیات بدل گئے اور حقائق نگاہ سے اوجھل ہو گئے۔ وہ مسلمان

جو سطحِ ارضی پہ جہانگیر اخوت کی بنیاد ڈالنے آیا تھا۔ وہ خود ایک تنگ و تاریک حجرے میں مقید ہو گیا۔ وہ جس نے ساحل سے اچھل کر بے کراں بننا تھا۔ ایک جوئے کثیف بن کے رہ گیا۔ وہ جس کے خرامِ ناز کا تماشا تمام عالم نے دیکھنا تھا، گامِ اول ہی پہ منزل سمجھ کے بیٹھ گیا۔ وہ جس نے نسلِ آدم کو اوہام و اباطیل کی دنیا سے نکالنا تھا خود سب سے بڑا پرستارِ اوہام بن کر رہ گیا اور وہ جس نے ظواہر و مناسک کے تمام بت توڑنے تھے، ہزاروں بت تراش کر خود ان کی پرستش میں محو ہو گیا۔ درست فرمایا تھا، حکیم الامت نے

تمدن، تصوف، شریعت، کلام بتانِ عجم کے پجاری تمام
یہ امت روایات میں کھو گئی حقیقت خرافات میں کھو گئی

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے اقبالؒ

ماخوذ از "ذو اسلام" از ڈاکٹر غلام جیلانی برق
صفحہ ۹۵-۹۷



مُنکرِ حدیث

دلائل میں کمزور اور عقل و فکر سے عاری ذہن فکری اختلاف رکھنے والوں کو صرف گالیاں ہی دے سکتا ہے۔ کمزوری کی کئی علامات ہوتی ہیں۔ ان میں ایک فکری کمزوری بھی ہے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت فکری اختلاف رکھنے والوں کو گالیاں اس طرح دیتی ہے کہ یہ مختلف اصطلاحات وضع کرکے ان پر چسپاں کردیتی ہے۔ اس میں ایک اصطلاح "منکرِ حدیث" کی بھی ہے۔ اس اصطلاح کو دانستہ طور پر مبہم رکھا گیا ہے۔ مگر عام تأثر یہ پھیلایا گیا ہے کہ جس پر اس کا اطلاق کیا جائے اسے کافر و مرتد سمجھو۔ "منکرِ حدیث" کی اصطلاح استعمال کرنے والوں میں وہ بھی شامل ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ حدیث قرآن کی آیت کو منسوخ کرسکتی ہے اور احادیث بھی وحی ہیں۔ قرآن کریم اگر وحی ہے تو احادیث بھی وحی ہیں۔ البتہ یہ "وحی غیر متلو" ہیں۔ وہ لوگ بھی اس اصطلاح کو استعمال کرنے والے ہیں جو احادیث کو "وحی" نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام اور قرآنِ کریم کی تشریح سمجھتے ہیں۔ یہ حضرات آپس میں احادیث کے مرتبہ اور سُنت کی تعریف پر بھی متفق نہیں ہیں۔ بلکہ ایک دوسرے کو "منکرِ حدیث" قرار دینے میں بھی کوئی مذائقہ نہیں سمجھتے۔

جہاں تک منکرِ حدیث کی اصطلاح کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کا اطلاق کسی بھی ایسے مسلمان پر نہیں ہوسکتا جو یہ اقرار کرتا ہو کہ وہ قرآن پر ایمان رکھتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری پیغمبر مانتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم از خود ایک پکی اور سچی حدیث ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سب سے پہلے ادا ہوئی۔ قرآنِ کریم ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے ہی ملا اور جب قرآنِ کریم پر ہم ایمان لے آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صدیق و امین تسلیم کرکے ہی قرآنِ کریم پر ایمان لائے۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کا کوئی مسلمان کیسے انکاری کہلا سکتا ہے۔

اب فکری اختلاف یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ سینکڑوں احادیث و روایات حضورؐ کے ساتھ ایسی منسوب کردی گئی ہیں جو قرآنِ کریم کی تعلیمات اور حقائق و شواہد سے متصادم ہیں اور مسلمان ہونے کے ناتے ہمارا ایمان ہے کہ حضورؐ کا کوئی قول و فعل قرآنِ کریم کے خلاف جا ہی نہیں سکتا۔ اس لئے ایسی احادیث و روایات من گھڑت ہیں اور حضورؐ سے غلط منسوب کردی گئی ہیں۔ عجمی سازش کا دینی اور من گھڑت احادیث و روایات گھڑنے کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اور قرآن میں وسیع خلیج حائل کرکے اس کو نکما، نااہل اور بیکار کردیا جائے۔ قرآنِ کریم حقیقت کی طرف دعوت دیتا ہے اور بے شمار احادیث اوہام کی طرف دعوت دیتی ہیں۔ جب ایسی سینکڑوں احادیث پر اعتراض کئے گئے تو دلائل سے بات کرنے کے بجائے "منکرِ حدیث" کی گالی دے دی گئی۔ گذشتہ سینکڑوں برس کی قرآن فہمی کی تاریخ کا یہ رُخ بھی ایک حصہ ہے۔

عام طور پر احادیث کے جذبے سے سرشار حضرات بڑے فخر سے سوال کرتے ہیں کہ قرآن میں ادائے نماز کا کوئی طریقہ تو درج نہیں اگر احادیث کے مجموعے نہ ہوتے تو ادائیگی نماز کا طریقہ کہاں سے معلوم کرتے؟

ان حضرات سے میری گذارش ہے کہ نماز ایک ایسا جسمانی حرکات و سکنات کا فعل ہے جو بر سرِ عام ادا کیا جاتا ہے۔ اس کا مظاہرہ روزانہ پانچ وقت مساجد میں جمعہ کے بڑے اجتماعات میں، عیدین میں اور سب سے بڑے اجتماع یعنی حج کے موقعہ پر اس کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ یہ ادائیگی نماز کا مظاہرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے مسلسل چلا آرہا ہے۔ حضورؐ نے نماز کی امامت کرائی اور رفتہ رفتہ ہزاروں صحابہ کبارؓ آپؐ کے پیچھے نماز ادا کرتے رہے اور پھر لاکھوں اور کروڑوں مسلمانوں نے صحابہ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعین کے پیچھے نماز ادا کی اور اس طرح اڑھائی سو سال کا عرصہ گذر گیا۔ کہ امام بخاری صاحب نے احادیث کا مجموعہ مرتب کرنا شروع کیا۔

اب یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دو اڑھائی سو سال کا عرصہ گذرتے گذرتے مسلمان نماز پڑھنے کا طریقہ بھول گئے تھے اور نماز پڑھنا متروک ہو چکی تھی کہ احادیث نے نماز پڑھنے کا طریقہ سمجھا کر دوبارہ نماز جاری کرائی؟ کیا اس وقت خانہ کعبہ میں بھی نماز متروک اور طواف ختم ہو چکا تھا؟ معاذ اللہ! یہ ناممکن ہے۔ البتہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے وہ ایسے کہ اڑھائی سو سال تک تو مسلمان ایک ہی نماز پر قائم تھے مگر احادیث نے چار قسم کی نمازیں تو اہلسنت والجماعت میں بنا دیں اور مسلمانوں

میں تفرقہ پیدا کر دیا اور اختلافات اس قدر شدید کہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا گوارہ نہیں۔ یہ حشر تو ہوا نماز کا احادیث و روایات کی وجہ سے اور امتِ مسلمہ پارہ پارہ ہو کر گروہوں اور فرقوں میں تقسیم ہو گئی امت میں تفرقہ پیدا ہو تو دین باقی نہیں رہتا۔ اگر احادیث کو نماز کے ادا کرنے کے طریقہ کی معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ قرار دیا جائے۔ تو پھر ان کی وجہ سے مسلمانوں میں جو تفرقہ پیدا ہوا اس کے لیئے اس آیہ کریمہ پر بھی غور کرنا پڑے گا جس میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۶/۱۶۰)

یعنی (اے رسولؐ) جن لوگوں نے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے۔ یقیناً ان سے تمہارا کچھ واسطہ نہیں۔

اس کا ایک بڑا بودا اور پھسپھسا سا جواب ملتا ہے کہ حضورؐ نے تمام طریقوں سے نماز پڑھائی تھی (معاذ اللہ)۔ یہ حضرات یہ نہیں سوچتے کہ یہ کہہ کیا رہے ہیں۔ ان حضرات کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرقہ بندی کے مُوجد تھے (معاذ اللہ معاذ اللہ) بلکہ اس بات کو مزید تقویت دینے کے لیئے ایک حدیث بھی گھڑی گئی کہ حضور نے فرمایا کہ "میری امت میں اختلاف باعثِ رحمت ہے"

احادیث کی حمایت کے جذبہ سے سرشار حضرات تو اس حد تک چلے جاتے ہیں کہ اگر ان سے پوچھا جائے کہ آپ کے پاس ان احادیث کا کیا ثبوت ہے کہ یہ واقعی اقوالِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ تو جواب ملتا ہے کہ تمہارے پاس قرآن کا کیا ثبوت ہے کہ واقعی

اللہ کا کلام ہے۔ قرآن کریم کو اس طرح لپیٹ میں لینے والوں سے کوئی پوچھے کہ تم عورت کی ایک گواہی پر کسی کو اپنا باپ تسلیم کر لیتے ہو تو وہ قرآن جو ساڑھے سات سو کے قریب آیات کو جو کہ ارض وسما میں پھیلے ہوئے حقائق کو شہادت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس پر صرف احادیث کے جذبے سے سرشار ہو کر اس سے غیر شریفانہ سلوک کر کے اسے الہامی کتاب تسلیم کیوں نہیں کرتے اور اس پر حملہ آور کیوں ہوتے ہو؟ یاد رکھئے! اللہ بڑا ہی غیور ہے۔ اور وہ اس کے برعکس وصف کے حاملین کو کبھی معاف نہ کرے گا۔

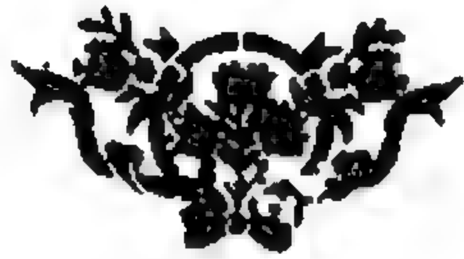
اہلحدیث کے سرخیل مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) جن کو شاید کسی نے "منکرِ حدیث" نہیں کہا۔ لکھتے ہیں:

"روایات کی قسموں میں سے کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روایت ہو بہر حال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ نہیں اور غیر معصوم کی شہادت ایک لمحہ کیلئے بھی یقینیاتِ دینیہ کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ ہمیں مان لینا پڑے گا کہ یہ (بخاری روایت در کذب حضرت ابراہیم) آپ کا قول نہیں ہو سکتا۔ یقیناً یہاں راویوں سے غلطی ہوئی ہے اور ایسا مان لینے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑے گا اور نہ زمین شک ہو جائیگی۔"

(ماخوذ از ترجمان القرآن جلد دوم صفحہ ۵۰۰ - ۴۹۹)

حقیقت یہ ہے کہ احادیث کے مجموعوں میں بے شمار احادیث ایسی ہیں جو مسلمانوں کو خاص طریقوں کا غلام بنانے کے لیئے وضع کی گئیں اور ان کو وحی یا ہم پایۂ وحی ٹھہرایا گیا اور قرآن کے مقابل خود ساختہ دوسرا قرآن کھڑا کیا گیا۔ مذہبی پیشوائیت نے اپنی باتوں کو وحی کے انداز میں منوانے

کی ایک گہری سازش کی ان کی نشاندہی کرنے والوں کے خلاف "منکر حدیث" کی اصطلاح کو بطور ہتھیار استعمال کیا گیا تاکہ ان کی ذیلی نبوتیں قائم رہیں اور جیسا کہ مَیں نے عرض کیا "منکر حدیث" کی اصطلاح کو دانستہ طور پر مبہم رکھا جاتا ہے۔ مگر عام تأثر یہ دیا جاتا ہے کہ جس پر اس کا اطلاق کیا جائے اس کو کافر و مُرتد سمجھو اس اصطلاح کا استعمال بدنیتی پر مبنی ہے کیونکہ اس کا اطلاق کسی مسلمان پر ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ اصطلاح بطور گالی استعمال ہوتی رہی ہے اور گالی دینا شرفا کا کام نہیں۔



قرآن کی بیچارگی اور احادیث کی سینہ زوری

قرآنِ کریم کے خلاف جو سب سے پہلی سازشش یعنی یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنِ کریم کو کتابی شکل میں اُمت کو دیا ہی نہ تھا۔ اور یہ کہاں کہاں اور کن کن مقامات و اشیاء پر لکھا ہوا منتشر حالت میں پڑا تھا اور پھر کن کن ادوار میں مختلف اطوار سے اس کو اکٹھا کر کے کتابی شکل میں لایا گیا۔ اس سارے عمل کا بغور مطالعہ کر لے کے بعد قرآن کی بے چارگی اور احادیث اور روایات کی سینہ زوری کا کچھ اندازہ تو آپ نے کر ہی لیا ہو گا۔

دین میں حجت کا رتبہ صرف قرآنِ کریم کو حاصل ہے۔ کیونکہ یہ لفظاً لفظاً وحی الٰہی ہے اور اس میں ایک لفظ کا ردّ و بدل نہ ہوا نہ کبھی ہو سکے گا۔ مگر احادیث کی سینہ زوری دیکھئے کہ ان کی رُو سے قرآنِ کریم میں کم از کم ایک آیت تو غائب ہے یعنی آیتِ رجم۔ یہ ساری بحثیں اور ان کا عقیدے کا رُوپ دھارنا سب عجمی سازشوں کا نتیجہ ہے۔ زمانہ قبل از اسلام عجمی عربوں سے زیادہ طاقتور اور ثقافت و تمدن کے لحاظ سے آگے تھے۔ یہاں تک کہ وہ ان سے لڑنا بھی اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ نفرت و حقارت سے وہ عربوں کو اُونٹنی کا دُودھ پینے والے اور گوہ کا گوشت کھانے والے کہتے تھے۔ گوہ ریت کا گھٹیا سا جانور ہے۔ جب عربوں میں اسلام کی شمع روشن ہوئی اور ایمانی قوت نے عجمیوں (ایرانیوں) کی قوت کو شکست دے کر ان کی سلطنت کو پاش پاش کر دیا۔ تو انہوں نے

اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ اب وہ میدانِ جنگ میں عربوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو بظاہر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ مگر اندر ہی اندر سازشوں کا جال پھیلانا شروع کر دیا۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ مختصراً یہ کہ آخرکار بنو عباس کے دَور میں یہ پوری طرح کامیاب ہو گئے۔ بنو عباس سے ملکر بنو امیہ کی سلطنت کا خاتمہ کرایا۔ بنو عباس نے چونکہ سلطنت ان عجمیوں کی مدد سے حاصل کی تھی اس لیئے یہ ان کے دربار کے اساور (لورتن) بن گئے۔ یہی وہ دَور ہے جس میں مذہبی پیشوائیت درباری گویوں کا کردار ادا کرتی رہی۔ سلاطین کی سطحی خواہشات کو شرعی تحفظ فراہم کرتی رہی۔ ان سلاطین کو "ظِلّ اللہ علی الارض" اور "خلیفۃ اللہ" کے القابات سے نوازتے ہوئے ممبروں سے ان کے نام کے خطبے پڑھے جاتے رہے۔ یہ ہی وہ دَور ہے جس میں احادیث، تفاسیر فِقہ اور تواریخ کی کتابیں معرضِ وجود میں آئیں۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ صِحاحِ ستہ کے تمام محدثین جن کا کہ تعلق اہلسنت والجماعت سے ہے تمام کے تمام عجمی (ایرانی) ہیں اور ان میں ایک بھی عربی نہیں۔

قرآنِ کریم کی تعلیمات کو مسخ کرنا اور اس کی محکمیت کو متزلزل کر کے اس کو توریت، انجیل، زبور وغیرہ منحرف شدہ الہامی کتابوں کے مطابق بنانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ قرآنِ کریم کے محکم حصار میں نقب زنی کیلیئے احادیث و روایات کا ہتھیار ازسرِ نَو تقریباً اڑھائی سَو سال بعد تیار کیا گیا۔ یہ بڑا مہلک ہتھیار تھا جو کامیاب رہا۔ بنو عباس کے دَور میں خاص طور پر کوفہ اور دیگر شہروں میں احادیث گھڑنے کے ٹیکسال کھل گئے اور ٹیکنیک یہ اختیار کی گئی کہ پہلے ایک حدیث گھڑی گئی۔ اس کے ساتھ

دو ایک نام راویوں کے منتقی کئے گئے ان راویوں کو مافوق الفطرت حد تک ایمان دار، پاکباز اور سچے بنایا گیا۔ اس عمل کو مزید مستند بنانے کے لئے علم الرجال کا فن ایجاد کیا گیا۔ جس میں احادیث کے متن کے بجائے راوی کے معتبر یا نامعتبر ہونے پر سارے علم کا زور لگایا گیا۔ پھر ان احادیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منسوب کیا گیا۔ اب کون سا مسلمان تھا جو اس کے انکار کی جرأت کر سکتا تھا۔ پھر ان احادیث کو وحی (وحیٔ خفی) کا درجہ دے کر قرآن کے مقابلے میں ایک دوسرا قرآن کھڑا کر دیا گیا۔ آج صورتِ حال یہ ہے کہ اگر آپ صحاح ستہ کے مجموعوں کا مطالعہ کریں تو آپ کو ہر قسم کی احادیث مل جائیں گی یعنی حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے والی بھی۔ قرآن کریم کی محکمیت کو متزلزل کرنے، وقارِ نبوت و شانِ رسالت کے خلاف بھی۔ ازواجِ مطہرات کی سیرت و کردار کے خلاف بھی اور سب سے بڑھ کر ایسی حیا سوز بھی کہ جن کو پڑھ کر علامہ عنایت اللہ المشرقی مرحوم چیخ اٹھے کہ یہ کوک شاستر ہیں۔

عجمی سازشیوں کو اسلام کے خلاف اپنی شکست کا بدلہ لینے کے مواقع کس طرح حاصل ہوئے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب ضیاء الدین کرمانی اپنی کتاب "THE LAST MASSENGER WITH A LASTING MESSAGE" میں لکھتے ہیں:

" رسولؐ کی بعثت کے وقت عرب معاشرہ قبائلی نظام کا پابند، جانباز خود پسند، توہم پرست اور اخلاقی قیود سے آزاد تھا۔ اسلام کی ابتدائی فتوحات کے دوران جب کہ اسلامی معاشرہ ابھی تشکیل کے مراحل میں تھا۔ ان موروثی خصوصیات کی موجودگی میں ایسے افراد کثیر تعداد میں دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے

جن کے عقائد نہ تو ابھی پختہ تھے اور نہ ہی انہیں اسلام سے مکمل وابستگی تھی۔ پھر بعد کی نسلیں چونکہ ان وسیع فتوحات سے حاصل ہونے والی خوشحالی کے دور میں پیدا ہوئیں اس لئے وہ آرام پسند اور کاہل ہو گئیں۔ ان دونوں باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان کا نوزائیدہ معاشرہ بیرونی ملکوں کی مفتوح قوموں کے زوال پذیر معاشروں کے جراثیم یعنی مضر اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔

آسائش اور فراوانی کی زندگی کے اثرات اور بالخصوص خلفائے بنو عباس کے دربار کے ذریعے پھیلنے والے بیرونی خیالات کی یورش کے ساتھ ساتھ عربوں کی قبائلی عصبیت کے دوبارہ نمودار ہو جانے کی وجہ سے جس کی بنیاد خاندان اور نسب کے فخر پر تھی اور جس سے بہت سے توہمات اور رسوم و رواج بھی وابستہ تھے قرآنی تصورات کے تحت نشوونما پانے والا نوزائید معاشرہ جو بنیادی طور پر فراخدلانہ اور عدل و مساوات پر مبنی نظام پر قائم تھا، بے معنی اور ناکارہ بن کر رہ گیا۔

"قبائلی عصبیت کا سب سے پہلا مظاہرہ حق خلافت یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سربراہِ مملکت کے اعلیٰ منصب کی جانشینی کے حق کو مکہ کے معزز و ممتاز قبیلے قریش سے، جس سے خود آنحضرت ؐ کا تعلق تھا، مخصوص کر دینے کا سیاسی مسلک تھا۔ یہ بنیادی طور پر ایک غیر اسلامی تصور تھا اور اسی کی وجہ سے مدینہ کے "انصار" اور مکہ کے "مہاجرین" کے درمیان اختلاف کی علامتیں پہلی مرتبہ صاف نظر آنے لگیں۔ مملکت کی نظریاتی بنیاد جب اس طرح کمزور کر دی گئی تو علاقائی وفاداریوں کو لازمی طور پر تقویت حاصل ہونے لگی۔ یہ صورتِ حال ان لوگوں کے لیے بیحد خوش آئند تھی جو ایسے موقعے کی تلاش میں تھے جس سے فائدہ اٹھا کر نئی نظریاتی مملکت کے تشکیلی مرحلے ہی میں اس

کی یکجہتی اور استحکام پر ضرب لگا کر عربوں سے اپنی شکست کا بدلہ لے سکیں۔
یہ لوگ نوزائیدہ مملکت کی جڑیں کھوکھلی کرنے کی غرض سے عربوں کے روایتی اختلافات کو ہوا دے کر ان کے قبائلی جذبات کو بھڑکانے لگے۔ انہوں نے بنو امیہ کے خلاف جو نبی اکرمؐ کے عہد سے ہی اقتدار میں بڑی حد تک شریک تھے، محروم ہاشمیوں کی حمایت شروع کر دی تاکہ مدنی معاشرے پر چھائے ہوئے اہل مکہ کی یکجہتی پارہ پارہ ہو جائے۔ جب حضرت عثمانؓ جو بنو امیہ ہی میں سے تھے، منصب خلافت کے لیے منتخب ہوئے تو ان فسادی عناصر کو بھرپور وار کرنے کا بہت موزوں موقعہ ہاتھ آگیا۔ اس عقیدے نے کہ بادشاہت کا حق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہے "امامت" کے تصور کو جنم دیا جس کے مطابق دنیوی اور مذہبی راہنمائی ہمیشہ کے لیے صرف خاندانِ رسولؐ کے افراد تک محدود کر دی گئی۔

قرآن سے اعراض

اسلام کی نظریاتی اساس پر اس قسم کے حملے صرف اس وجہ سے ممکن ہوئے کہ یہودیوں کے فلسفیانہ ادب سے متاثر ہو کر "وحی متلو" یعنی تورات اور "وحی غیر متلو" یعنی تالمود (مجموعہ احادیث) کے درمیان ایک بے معنی مگر بظاہر خوشنما فرضی امتیاز پیدا کر کے قرآن کی سند کو کمزور کر دیا گیا۔ اب دوسرے لفظوں میں "وحی متلو" وہ وحی قرار پائی جو ضبطِ تحریر میں لائی گئی۔ یعنی کتاب اللہ اور "وحی غیر متلو" وہ قولِ رسولؐ جو ابتداءً ایک شخص سے دوسرے کو زبانی پہنچایا جاتا رہا۔ اس طرح ہوا یہ کہ رفتہ رفتہ قولِ رسولؐ کو اللہ تعالیٰ کے تحریر شدہ کلام (کتاب اللہ) پر گونہ ترجیح دی جانے لگی اور اسے آیاتِ قرآن کے مفہوم میں اضافہ، اختصار یا تنسیخ تک کرنے کا مجاز قرار دے دیا گیا۔ اب قرآن کی تشریح و تفسیر اس طرح کرنا لازم قرار

پا گیا کہ وہ بہر طور مبینہ قولِ رسولؐ کے مطابق ہو جائے۔

بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مملکت کے شورش پسند عناصر نے رسولِ اکرمؐ کی وفات کے فوراً بعد یہ دیکھ کر کہ آپ کے معتمد معاونین بنی نوعِ انسان کی فلاح کا انقلابی پیغام ہمسایہ ممالک کے پامال اور خستہ حال عوام تک پہنچانے میں ہمہ تن مصروف ہیں اور وہاں انہیں سر دست مستقل مفادات کے حامل طبقے کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ملک کے اندر غلبہ حاصل کر لیا اور دین کے شارح اور محافظ ہونے کے دعویدار بن بیٹھے۔ یہ محض اتفاقی بات نہیں کہ مسلمانوں کی تہذیبی تاریخ کے ابتدائی علمار دین (متکلمین)، لغات نویس، ماہرینِ صرف و نحو اور مؤرخین زیادہ تر غیر عرب تھے جنہوں نے اپنے اپنے میدان میں بہت کچھ قابلِ قدر کام کیا لیکن وہ سب اربابِ فکر و دانش راہنما کہلانے کے ہرگز مستحق نہ تھے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ بعد میں خود عرب عادۃً انہیں بعض غیر عرب ماہرین کا اتباع کرنے لگے جن کی راہنمائی بدنیتی سے خالی نہ تھی۔

شخصیت پرستی

اپنی نیک نیتی کا مظاہرہ کرنے اور سادہ لوح عوام کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے ان شورش پسند عناصر نے اپنے گروہی نظریات کی تائید میں جو بعض اوقات قرآنی تعلیمات سے بھی متصادم تھے۔ ہر قسم کی نام نہاد احادیث خود وضع کر کے اور ڈھٹائی کے ساتھ رسولِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے منسوب کر کے پھیلانی شروع کر دیں۔ یہ لوگ احکامِ قرآن کی ظاہری شکل (متن) اور ان کی روح (بطن) میں بہ ظاہر خوشنما مگر غیر واقعی فرق بتلاتے ہیں اور ان میں سے بعض باطن سے زیادہ ظاہر اور بعض ظاہر سے زیادہ باطن پر زور دیتے تھے۔ بہر حال یہ بات ظاہر ہے کہ خود رسولِ اکرمؐ نے اپنے متبعین کو وحیٔ قرآن کے سوا اپنا فرمودہ قلمبند کرنے سے

جو منع فرمایا تھا وہ کسی معقول وجہ کے بغیر نہ تھا۔ دُور اندیش حضرت عمرؓ بن الخطاب نے بھی اپنے عہدِ خلافت میں روایات و احادیث کی اشاعت کی قطعاً حوصلہ افزائی نہ کی اور سُنی سنائی جھوٹی سچی باتیں رسول اللہ صلعم سے منسوب کر کے لوگوں میں پھیلانے والوں کو یہ کہہ کر سزائیں دیں کہ ہمارے لیئے کتاب اللہ کافی ہے۔

دینِ خالص کے لیئے خود قرآن کا ارشاد ہے

"اس کتاب کے بعد تم اور کس بات (حدیث) پر ایمان لاؤ گے؟

الاعراف ۱۸۵

کیا یہ بات معنی خیز نہیں کہ اس آیت میں "بات" کیلیئے "حدیث" ہی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

احادیث کے نام پر جو کچھ ہم تک پہنچایا گیا ہے وہ ایسے ذہن کی عکاسی کرتا ہے جس کی تشکیل بظاہر "جدلیاتی مادیت" کی اصطلاح میں "انقلاب دشمن قوتوں" کے ایسے پروپیگنڈے سے ہوئی جو اصلاح و ترقی کا دشمن تھا اور جس کا مقصد ہی نوزائیدہ اسلامی معاشرے کو تباہ کر دینا تھا۔ یہ مخالف عناصر ہر قسم کی مادی ترقی کی مذمت کرتے۔ فقر اور ترکِ دنیا کی خوبیوں کے راگ الاپتے اور اسباب آرام و آسائش کو تج دینے کی تلقین کرتے تھے۔ لیکن ان کا حقیقی مقصد اس ترغیب و تلقین کے ذریعے منظم مملکت کو درہم برہم کرنا اور سادہ لوح عوام کو راہِ فرار دکھانا تھا۔ چنانچہ اس پر حیرت نہیں ہونی چاہیئے کہ وہی لوگ جنہوں نے کبھی اپنے ترقی پسند نظریات کی بناء پر متمدن دنیا کی راہنمائی کی تھی، آہستہ آہستہ زندگی کے ہر شعبے سے نکال دیئے گئے اور اپنی موجودہ ناقابلِ رشک حالت کو پہنچا دیئے گئے۔

امتِ مسلمہ کی ابتدائی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے یہ ضرور محسوس کریں گے کہ اسلام میں فرقہ بندی کی بنیاد جس کے محرکات بلاشبہ سیاسی تھے رسولِ اکرمؐ سے منسوب کردہ ان نام نہاد احادیث ہی کی روشنی میں کی جانے والی قرآن کی تشریح وتفسیر پر رکھی گئی جنہیں محدثین کا ایک مکتب "صحیح" اور دوسرا وضعی یا جعلی سمجھتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ "احادیث کی درجہ بندی ان کے متن کی چھان پھٹک سے زیادہ راویوں کے معتبر ہونے کے بارے میں داخلی اور ذاتی اندازوں کی بنا پر کی گئی ہے۔ چنانچہ آج جو شخص کسی حدیث کے بارے میں جسے "صحیح" قرار دیا گیا ہو کوئی اعتراض کرتا ہے وہ دراصل رسول اللہؐ کی سند پر نہیں بلکہ اس محدث کی سند پر شبہ کا اظہار کرتا ہے جس نے اسے "صحیح" قرار دیا تھا یا ان راویوں کے معتبر ہونے پر شبہ کرتا ہے جنہوں نے اسے رسولِ اکرمؐ سے منسوب کیا تھا۔

جس شخص نے بھی مندرجہ ذیل "حدیث" وضع کی جو اتنی لیقینی نہیں جتنی کہ مشہور ہے۔ اس نے مسلم معاشرہ کے ساتھ بڑا ظلم کیا۔

"میری اُمت (کے لوگوں) کا اختلاف رحمت ہے"

(سیوطی۔ جامع صغیر)

ناقدین نے اس نام نہاد حدیث کو جو رسولِ اکرمؐ سے منسوب کی گئی ہے جعلی قرار دیا ہے یہ بات معنی خیز ہے کہ یہ "حدیث" کسی مستند مجموعہ احادیث میں نہیں ملتی۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لئے علامہ تمنا عمادی کے رسالہ "اختلافِ اُمت" (صفحات ۵۰ - ۴۲) کا مطالعہ مفید ہوگا۔ اس وضعی حدیث کی وجہ سے دین کے اندر اختلافی گروہوں کی تشکیل کے رجحان کی سب سے زیادہ حوصلہ افزائی ہوئی۔ باوجود اس کے کہ قرآن نے متنبہ کردیا تھا کہ،

"یقیناً تمہیں (اے رسول) ان لوگوں سے کوئی سروکار نہیں جنہوں نے اپنے دین کو اختلافی گروہوں میں بانٹ دیا اور فرقے (شیعًا) بن گئے۔"
(الانعام ۱۶۰)

یہاں بھی لفظ شیعًا کا انتخاب معنی خیز ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کتاب اللہ سے رابطہ کا ٹوٹنا ہی دراصل اسلام کا سب سے پہلا حادثہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کو نظر انداز کرنے کی سزا میں مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا عتاب اسی طرح نازل ہوگیا جس طرح کہ یہودیوں پر ہوا تھا۔ جن کے بارے میں قرآن نے بتایا ہے کہ (توراۃ میں مذکور) اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کی پاداشں میں ان کے لیئے زندگی کی وہ پاک چیزیں بھی حرام ہوگئیں جو ان کے لیئے جائز اور حلال قرار دی جا چکی تھیں۔
(النساء ۱۶۱ - ۱۶۰)

صورتِ حال کو مزید پیچیدہ ان نیک نیت علماء نے بنا دیا جو یہ تباہ کُن عقیدہ رکھتے تھے کہ اگر عقیدہ نیک اور اعلیٰ ہو تو اس کے حصول کیلئے غلط ذرائع اختیار کرنے میں بھی کوئی مذائقہ نہیں۔ یہ علماء لوگوں کو "عمل" پر اس طرح آمادہ کرتے کہ جس بات کو وہ اچھا سمجھتے اس کی ترویج کے لیئے ان میں جوشِ عمل پیدا کرتے یا جس چیز کو وہ بُرا سمجھتے اس سے باز رکھنے کی غرض سے "احادیث" وضع کرنے میں ضمیر کی کوئی خلش محسوس نہ کرتے۔ اس کے علاوہ وہ قرآن کی آیات کے صاف اور واضح مفہوم تک کو اپنے نظریات کی تائید کے لیئے یہ کہہ کر بدل دیتے تھے کہ انہیں ان آیات کے "شانِ نزول" کا خصوصی علم حاصل ہے۔ یہ سب کچھ اسی عقیدے کی بناء پر کیا جاتا تھا کہ مقصد نیک ہو تو ذریعہ کوئی بھی اختیار کیا جاسکتا ہے

ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب صحیح اور غلط، سچ اور جھوٹ، حقیقی اور وضعی میں تمیز کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔

ماخوذ از "ابدی پیغام کے ابدی پیغامبر" صفحہ ۴۰ تا ۴۶)
مترجم اختر حسین ہاشمی۔

انسانی عقل محدود ہے جب کہ اس کی جہالت لامحدود ہے۔ اسلامی لٹریچر کا اگر قرآن کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے تو اس کی کثرت لامحدود اوصاف سے مالا مال نظر آتی ہے۔ اس کا بغور مطالعہ کرنے سے اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس کی کثرت قرآنِ کریم کے خلاف محاذ آرائی کا ایک پلندہ ہے۔ قرآنِ کریم نے جن باتوں کی کثرت کے ساتھ ممانعت کی ہے اسلامی لٹریچر میں اسی کو ہی زیادہ مستند گردانا گیا ہے۔

یہاں میں صرف دو مثالوں پر ہی اکتفا کروں گا۔ اوّل فرقہ بندی۔ دوم اسلاف پرستی۔

فرقہ بندی

یہ بات تو ایک عام مسلمان یعنی صرف مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے والا اور دین کی ابجد سے بھی ناواقف دیکھ کر حیران ہوتا ہے کہ جب قرآن ایک ہے۔ رسولؐ بھی ایک تو پھر مسلمانوں میں اتنے فرقے کیوں ہیں اور فرقے بھی ایسے کہ ایک دوسرے کو کافر و مرتد گردانتے ہیں اور شدید عصبیت میں مبتلا ہیں تو ایسا کیوں ہے؟ ظاہر ہے ان فرقہ بازوں کے پاس اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں ہے اور پھر فرقہ بندی کو قرآنِ کریم نے بھی ایک لعنت قرار دیا ہے۔ کہیں کہا کہ یہ قوموں کی تباہی کا باعث ہے۔ کہیں کہا کہ یہ شرک ہے اور کہیں یہاں تک ارشاد فرما دیا۔ "اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا

لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۶/۱۶۰)

"(اے رسولؐ) جن لوگوں نے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا اور گروہ گروہ بن گئے یقیناً ان سے تمہارا کچھ واسطہ نہیں"

اب ظاہر ہے کہ جس بدنصیب کا رسولؐ سے کوئی واسطہ نہیں اس کو تو مسلمان کہلانے کا بھی کوئی حق حاصل نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرقہ بندی کے خلاف واضح نفرت وحقارت کے اظہار کے باوجود ایک حدیث وضع کرکے مسلمانوں میں عام کردی گئی کہ رسولؐ نے فرمایا کہ میری اُمت میں اختلاف باعثِ رحمت ہے۔ اس کو فرقہ بندی یا مختلف مسالک یا مختلف مکاتبِ فکر کی وضع کردہ اصطلاحات کے جواز کے طور پر پیش کردیا جاتا ہے۔ یہ حدیث اگرچہ کسی مستند حدیث کے مجموعے میں تو درج نہیں مگر اس کا تذکرہ عام کیا جاتا ہے البتہ صحاح ستہ میں سے سنن ابن ماجہ میں درج ہے

ہر ایک امت کے کئی فرقے ہونا: ابوہریرہؓ سے روایت ہے آنحضرت صلعم نے فرمایا یہود کے اکہتر فرقے ہوگئے اور میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے۔

عوف بن مالک سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہود کے اکہتر فرقے ہوئے ان میں سے ایک جنتی ہے اور ستر دوزخ میں جاویں گے اور نصاریٰ کے بہتر فرقے ہوئے ان میں سے اکہتر دوزخی ہیں اور ایک جنتی قسم اس کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے میری امت تہتر فرقہ ہو جاوے گی ان میں سے ایک جنتی ہے اور ۷۲ دوزخ میں جاویں گے لوگوں نے عرض کیا وہ جنتی فرقہ کون سا ہے آپ نے

فرمایا "جماعت"۔

انس بن مالک سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیشک بنی اسرائیل اکہتر فرقے ہو گئے اور میری امت بہتر فرقے ہو جاوے گی۔ سب دوزخی ہیں سوا ایک فرقہ کے (جو بہتر کے سوا ہے تو کل تہتر فرقے ہوئے جیسے اگلی روایت میں ہے) وہ جماعت کا فرقہ ہے۔

(سنن ابن ماجہ جلد سوم صفحہ ۲۷۲ - ۲۷۱)

اس حدیث نے مسلمانوں میں ڈنکے کی چوٹ فرقہ بندی کی راہ ہموار کر دی اور اس کا جواز فراہم کر دیا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ احادیث نے بہت خدمت سر انجام دی کہ اس کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ احادیث فرقہ بندی کا باعث بنی ہیں اور فرقہ بندی کو ان سے فروغ ملا ہے اس لئے کہ ہر فرقہ اپنے اپنے مسلک کی تائید میں حدیثی اسناد پیش کرتا ہے۔ اس طرح احادیث نے فرقہ بندی کیلئے بہت مواد فراہم کیا ہے اور عصبیت کی جڑیں مضبوط کی ہیں۔ فرقوں کا وجود شرک ہے۔ رسولؐ کا ان سے واسطہ کوئی نہیں۔ ہدایت وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہے۔ ہدایت صرف قرآن ہے۔ یہ بات اگر سامنے رکھ لی جائے تو سارے فرقے مٹ جاتے ہیں اور اگر احادیث کو سامنے رکھ کر بات کی جائے گی تو فرقے ہی فرقے ہوں گے۔ حدیث کی سند کسی نہ کسی انسان تک جا کر رک جائے گی۔ اگر اللہ کی ہدایت سامنے رکھ لی جائے تو دو انسانوں میں بھی آپس میں اختلاف نہیں رہ سکتا۔ بشرطیکہ ذہن پہلے سے غیر متعصب ہو اور سچائی تک پہنچنے کا ارادہ ہو۔

تفرقہ پیدا ہو تو دین باقی نہیں رہتا۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

تبلیغِ اسلام اور تمکین دین کی جد و جہد کرنے کے ساتھ ساتھ . مسلمانوں کی (معاذاللہ) حوصلہ شکنی بھی کرتے رہے کہ ان کی حیاتِ طیبہ کے بعد مسلمان تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائیں گے اور دین باقی نہ رہے گا ؟ رسول ایسی پیشین گوئیاں کر کے کون سا دینی فریضہ ادا کر رہے تھے ؟

یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے خلاف عجمی سازشوں کا شاخسانہ ہے . چونکہ ہماری مذہبی پیشوائیت کے پاس فرقہ بندی کا کوئی جواز نہ تھا اور قرآنِ کریم نے بھی اس کی شدید مذمت کی ہے اس لیے اسلامی لٹریچر میں عجمیوں کی داخل کردہ من گھڑت باتوں کو حدیث کا درجہ دے کر مقدس بنا دیا۔ ایسا فرقہ بازوں نے اپنے اپنے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کیلئے کیا اور معاملہ دراصل پیٹ کا تھا . پیٹ تو ہم سبھی کے ساتھ لگا ہے . مگر کچھ کے ساتھ پاپی پیٹ لگا ہوتا ہے جو صرف جہنم کی آگ سے ہی بھر سکتا ہے قرآنِ کریم نے مسلمانوں سے جہاں اور احسانات کا ذکر کیا ہے وہاں یہ بھی ہے کہ تم ریت کے ذروں کی طرح بکھرے ہوئے تھے . تمہیں سیسہ پلائی دیوار کی مانند کر دیا۔ تمہارے آپس میں دل جوڑ دیے اور تمہیں بھائی بھائی بنا دیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اللہ کا یہ احسان تو اتار دیا ہے۔

اسلاف پرستی

قرآنِ کریم اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ اس نے اسلاف پرستی کو جس قدر بار بار رد کیا ہے . دنیا کی کوئی کتاب اس کی مثل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس روش کو اس قدر مردود گردانا ہے کہ اس کیلئے کوئی خاص دلیل دینا بھی پسند نہیں کیا یعنی اس کو بے دلیل رد کیا ہے . اس رجحان کو مردود قرار دینے کیلئے قرآن بھرا پڑا ہے . مگر حیرت کی بات ہے کہ قرآن کریم جس قدر اسلاف پرستی

کا دشمن ہے ۔ اسی قدر ہماری مذہبی پیشوائیت اس کو عزیز رکھتی ہے ۔
اسلاف پرستی کے رجحان کو نہ صرف یہ کہ قوی اور مستند گردانا گیا ہے بلکہ اس کو بہت مقدس بھی بنا دیا گیا ہے ۔ اسلاف کے تقدس سے تو انکار نہیں مگر کسی کی ذات کا تقدس قابلیت اور اہلیت کا نعم البدل تو نہیں ہو سکتا ۔ اسلاف کے حوالہ جات کسی بات کے مستند ہونے کی بڑی قوی دلیل تصور کی جاتی ہے ۔ قرآنی حوالہ جات اور دلائل ثانوی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ان کو تبرکاً بامر مجبوری پیش کر دیا جاتا ہے ۔

انسان فطرتاً اپنے آپ کو کمزور بے بس اور ناتواں محسوس کرتا رہا ہے اور جو اپنے آپ کو مضبوط اور طاقتور بنا لیتا وہ غرور اور تکبر کا شکار ہو جاتا رہا ہے ، خواہ وہ جسمانی طور سے ہو یا فکری لحاظ سے اور یہ سب جہالت کی بنا پر ہوتا رہا ہے ۔ یہ انسانی تاریخ ہے جہالت کے دور میں قد آور شخصیات ابھرتی ہیں جو انسانوں کے دلوں اور ذہنوں (اذہان) پر غالب آ جاتی ہیں ۔ پھر ان قد آور شخصیات کا کہا حرفِ آخر بن جاتا ہے اور ان کی فکری پوجا شروع ہو جاتی ہے ۔ آج سے ہزار سال پیشتر کا انسان موجودہ دور کے انسان سے یقیناً زیادہ جہل میں پھنسا ہوا تھا ۔ اسی لیے اس دور میں ہم کو زیادہ قد آور شخصیات ملتی ہیں جن کی فکری پوجا ہوتی چلی آ رہی ہے ۔ اس طرح اسلاف پرستی مسلمانوں کے ایمان کا جز بن چکی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تفکر و تدبر پر صدیوں کی پابندی سے مسلمان تحقیق کو ہی غیر ضروری سمجھنے لگے ہیں ۔ آدم سے لے کر آج تک مرنے والوں کے اسلاف تھے ۔ اور ہر ایک نے ایک دوسرے سے استفادہ کیا مگر حرفِ آخر نہ سمجھا ۔ کسی نے از خود عقل و فکر سے اور تجارب و اغلاط

(TRIAL AND ERROR) کے عمل سے گزر کر اور کسی نے وحی کی روشنی میں غور و فکر کر کے ہر قسم کی ترقی کی منازل طے کیں۔ اگر ترقی یافتہ قومیں ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرح صرف اپنے قریبی اسلاف پر تکیہ کر کے بیٹھ جاتیں تو شاید ابھی تک دھات کے زمانے سے آگے نہ بڑھتیں۔ قرآن کریم دعوت ہی عقل و فکر کو دیتا ہے اور تفکر و تدبر پر اس قدر زور دیتا ہے کہ اس کے بغیر لایا ہوا ایمان بھی ایمان تسلیم نہیں کرتا۔ مگر قرآن کے خلاف عجمی سازشوں کا نتیجہ ہے کہ غور و فکر کو ہی حرام قرار دیا جا چکا ہے اور خدائی خدمتگار مسلمانوں کے پیچھے لٹھ لیے پھرتے ہیں کہ صرف اسلاف کی فکری پوجا کرو۔ یعنی اسلاف پرستوں کا زور صرف اس بات پر ہے کہ جو بھی اہلِ فکر پیدا ہونے تھے وہ تو ہزار سال پیشتر پیدا ہو چکے اب قیامت تک ان کے پیچھے پیچھے چلنے والی بھیڑیں ہی پیدا ہوں گی۔

انسان کبھی ایسی حالت کو نہیں پہنچ سکتا کہ جہاں اسے فکری ترقی کرنے کی حاجت باقی نہ رہے البتہ یہ بات ذہن نشین رہے کہ تفکر و تدبر اور تحقیق صرف قرآن ہی کی روشنی میں کی جا سکتی ہے کیونکہ صداقت کا معیار صرف قرآن ہے قرآنِ کریم بنی نوعِ انسان کے لیے آخری ہدایت کی کتاب ہے اور آخری پیغام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنچا دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ ختمِ نبوت اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان ذہنی اور فکری طور پر اس مقام پر پہنچا دیا گیا ہے کہ جہاں اسے اور پیغامِ الٰہی کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ کتاب اللہ کی روشنی میں وہ اپنے معاملات پوری طرح سمجھنے اور طے کرنے کے قابل ہو چکا تھا مگر ہمارے ذہنوں میں اسلاف کا تقدس اس حد تک بڑھایا گیا کہ ہم نے اپنی خداداد قوتِ فیصلہ کو ایک طرف رکھ دیا اور اپنے آپ کو مترجموں، مفسروں

اور منکروں کی رائے کا غلام بنالیا۔ ان کی رائے کو سمجھنے اور پرکھنے کے بجائے ہم نے اسے سند بنالیا اور تقلید کو طرزِ فکر کے طور پر اختیار کرلیا۔ رفتہ رفتہ ہم خود سوچنے سمجھنے کی قوت سے دستبردار ہوگئے اور اہل الرائے ہمارے قول و فعل کے مالک بن گئے ہماری رائے اہل الرائے کے تابع ہوگئی اور ہم نے ذہنوں پر بہ رضا و رغبت رضاکارانہ طور پر جہالت کی چادر ڈال لی۔ اب فکری جمود کی انتہا ہو چکی ہے۔ ہمارے علماء ہزار برس سے اپنے سے بڑے علامہ کی سند تلاش کرنے میں مصروف رہے ہیں۔ اس لیے ان کے ذہنوں میں کشاد پیدا نہیں ہوسکی جس کی وجہ سے یہ تنگ نظری اور ہٹ دھرمی کی علامت بن چکے ہیں۔ تقلیدی رجحان فکری دیوالیہ پن کی علامت ہے۔ تقلید پسند اور عقل کا اندھا ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ تفکر و تدبر کو خیرباد کہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ امتِ مسلمہ فروعی مسائل میں الجھ کر رہ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی لٹریچر کی کثرت فروعی مسائل اور غیر ضروری مباحث کا ایک پندار ہے جس کا قرآنی تعلیمات سے کوئی سروکار معلوم نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص آمین بالجہر، رفع یدین اور قرأت فاتحہ کی تحقیقات میں اپنا تمام وقت صرف کرے تو اس کی عمر کا ایک بڑا حصہ تو اس میں تمام ہو جائے گا اور اگر "فضائلِ مسواک" اور "مسائلِ غسلِ جنابت" پر جو تحقیق ہو چکی ہے۔ اس کا مطالعہ شروع کردے تو باقی عمر بھی تمام ہو جائے گی۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو قرآن کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے کا حکم دیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبہ میں اس کی تاکید بھی فرمادی مگر مذہبی پیشوائیت نے تقلید کا پھندا تو مسلمانوں کے گلے میں ڈال دیا اور اللہ کی رسی کا تاج بناکر خود تخت کی مالک بن بیٹھی۔ اب جنت و دوزخ کے سرٹیفکیٹ

بانٹنے کے اختیارات انہیں کے پاس ہیں۔ کسی کو کافر کسی کو مرتد گردانا اب انہی کا استحقاق ہے۔ قرآن کی تفسیر و ترجمانی بس یہ لوگ اپنے مخصوص عقائد داخل کرتے ہیں اور کہتے ہیں قرآن یہ کہتا ہے۔ ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ وحی کی مانند ہو جاتا ہے۔ ان کی ہر تشریح الہامی بن جاتی ہے ان کی ہر توضیح شریعت قرار پاتی ہے۔ مختصر یہ کہ دین پر ایسے دستارِ فضیلت والوں کا قبضہ ہے کہ جن کی فلسفیانہ موشگافیوں منطقیانہ قیاس آرائیوں اور تاویلات کے گورکھ دھندوں نے قرآنی تعلیمات کو ایک چیستاں بنا کر رکھ دیا ہے۔ آج دین پر ان نام نہاد علماء کی اجارہ داری قائم ہے جو علم کے زور پر جہالت پھیلانے کے چیمپئن ہیں۔

ملوکیت کا اسلام

آج ہمارے پاس جو اسلامی لٹریچر ہے اس کی ابتداء تقریباً دوسری صدی ہجری میں عباسی دور میں ہوئی۔ یہ لٹریچر چونکہ عباسی سلاطین کے زیرِ سایہ پروان چڑھا۔ اس لیے قرآنی تعلیمات سے سروکار کم اور سلاطین کی ناجائز اور سفلی خواہشات کو زیادہ مدنظر رکھ کر مرتب کیا گیا۔ اسی لیے مولانا عبید اللہ سندھی نے اس کو بادشاہوں کے اسلام کا نام دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

" اپنے غفلت شعار بادشاہوں اور امیروں کی سستی کا بُرا نتیجہ ہے جو ہم آج بھگت رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارا مذہب اگر قرآن سے ماخوذ ہے اور قرآن اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے اسلام کو ہی اس دنیا میں نافذ کرنا چاہتا ہے تو کیسے ممکن ہے کہ ہم دنیا کے مقابلے میں پسپا ہو سکتے۔ لیکن یہ ماننا پڑے

گا کہ ہمیں یا زیادہ الفاظ میں ہمارے بادشاہوں کو واقعی شکست ہو چکی ہے
اب اگر ہم نے ان بادشاہوں کی شکست خوردہ باقی ماندہ میراث کو اسلام
سمجھ لیا تو میری رائے یہ ہے کہ ہمیں اس اسلام کی پوری شکست مان لینی
چاہیئے۔ جب تک ہم نے اپنی اس شکست کا اعتراف نہ کیا، ہماری نسلوں کے
ذہن اسلام کی صحیح اور حقیقی تعلیم کے متعلق کبھی صاف نہیں ہوں گے اور وہ
طرح طرح کے توہمات میں برابر الجھے رہیں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم
بادشاہوں کے "اسلام" کی کلی شکست کو تسلیم کرلیں تاکہ نئی نسل کو نئے سرے
سے کام کرنے کی ہمت پیدا ہو۔ دانشمندی اور دیانت داری کا تقاضا یہ ہے کہ ہم
غلط اصولوں کی تصحیح میں نئی نسل کے دماغوں کو الجھانا چھوڑ دیں۔"

(شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ از مولانا عبیداللہ سندھی صفحہ ۶۲)

اللہ کا خوف علم کی ابتدا ہے اور علم کا خزانہ کتاب اللہ ہے۔ جب
تک مسلمان کتاب اللہ سے جڑے رہے۔ علمی منازل طے کرتے گئے اور
کامرانیاں ان کے قدم چومتی گئیں۔ جب اللہ کا خوف ختم ہوگیا اور ملوکیت
کا خوف طاری ہوگیا تو مسلمانوں نے جہالت کا واپسی سفر شروع کردیا۔ رفتہ رفتہ
اسی مکی دور میں واپس چلے گئے جہاں کہ پہلی وحی نازل ہوئی تھی۔ آج ہم اتنے
بدنصیب ہیں کہ مسلمانوں کے دلوں میں قرآن کریم کی محکمیت کا وقار بٹھانا۔ اس
کو خود متکلفی SELF EXPLANATORY منوانا۔ اس کو کتاب عظیم باور کرانا اور
اس کی صداقتوں کا یقین دلوانا اتنا ہی مشکل ہو چکا ہے جتنا کہ رام داس سے
کلمہ پڑھوانا۔ اس طرح فکری لحاظ سے ہم دوبارہ اسی مکی دور میں داخل ہو چکے ہیں
آج ہم بڑے بڑے اماموں کی جلالت شان کی دھاک تو بٹھا سکتے ہیں مگر

قرآنِ کریم کی دھاک بٹھانا کارِ دارد ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہم نے قرآنِ کریم کو وہ درجہ دیا ہی نہیں کہ جس کا یہ متقاضی ہے، تو بے جا نہ ہوگا۔

ہمارے پاس خدا اور اس کا تصور بھی عجمیوں کا ہے۔ ہمیں قرآن کے اللہ کی ضرورت ہے یہاں میں ضمناً عرض کردوں کہ مجوسی اپنے سب سے بڑے بُت، جس کی وہ پُوجا کرتے تھے "خدا" کہتے تھے۔ جب وہ مسلمانوں سے شکست کھاکر مجبوراً مسلمان ہوئے تو اپنے ساتھ اپنے "خدا" اور اس سے منسلک عقائد بھی اپنے ساتھ لائے۔ یہی وجہ ہے کہ صدیوں کی عجمی دستبرد سے متأثر ہوکر اسلامی عقائد معجونِ مرکب بن چکے ہیں۔ لہٰذا مروجہ مسخ شدہ اسلام کی جگہ از سرِ نَو قرآن کا اسلام نافذ کرنا ہوگا۔ ہمیں اپنے اپنے حصّے کا دِیا روشن کرنا پڑے گا۔ اپنے اپنے حِصّے کا دِیا روشن کرتے چلے جائیں۔ اندھیرے چھٹتے چلے جائیں گے۔

جیسا کہ مَیں گذشتہ صفحات میں عباسی دَور کی ایرانی سازشوں کا اشارہ کرچکا ہوں اور یہ کہ صحاحِ ستہ کے تمام محدثین ایرانی تھے اس کے متعلق حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

> "تسخیرِ ایران کا نتیجہ یہ نہ نکلا کہ ایران اسلام کا حلقہ بگوش بن گیا۔ بلکہ یہ نِکلا کہ اسلام ایرانیت کے رنگ میں رنگا گیا۔
>
> مقالہ نیو ایرا ۲۸، جولائی ۱۹۱۷ء
>
> یہی ایرانی اسلام" یعنی ہمارا مجوسی وِرثہ ہے جو صدیوں سے مروّج چلا آرہا ہے اس میں نہ شیعہ کی تخصیص ہے نہ سنّی کی نہ اہلحدیث کی نہ اہلِ فقہ کی نہ اربابِ شریعت کی نہ اصحابِ طریقت کی، سب اسی کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔

تمدن تصوف شریعت کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

(ماخوذ از "اسلام میں فرقہ بندی کی ابتدا از قاضی قدیر الدین صفحہ ۲۱۱)

سوال یہ ہے کہ کیا عجم کی اس سازش کا توڑ ممکن ہے اور اسلام کو اس ملبہ کے نیچے سے نکالا جاسکتا ہے؟ علامہ اقبال کا جواب یہ ہے کہ ایسا ممکن ہے اور یقیناً ممکن۔ بشرطیکہ اسلامی دنیا عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت ہوئی۔

حسبنا کتاب اللہ

ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے

وما علینا الا البلاغ المبین

طلعت محمود بٹالوی

والسلام